

تفصیلات

جملہ حقوق بحق ناشر و مولف محفوظ ہیں۔

نام کتاب: حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال

اور ان پر ہوئے شبہات کا ازالہ

جامع و مرتب: جناب حضرت مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی۔ دامت برکاتہم

خادم الحدیث والعقائد، جامعہ حسینیہ، راندر، سورت، گجرات، انڈیا۔

صفحات: ۱۷۶

پہلا ایڈیشن: ۲۷ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ بمطابق ۴ اپریل ۲۰۱۹ء

تحریک تبلیغ کے موجودہ حالات میں۔

مثبت انداز میں علوم اسلامیہ کی

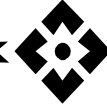
روشنی میں بحکمت و بصیرت۔

غلط فہمی کا ازالہ

حضرت مولانا محمد سعد صاحب

کے اقوال اور

ان پر ہوئے شبہات کا ازالہ



ناشر: مکتبہ حبان

ایلول نزد نور مسجد

تحصیل: ہمت نگر، ضلع: ساہیوڑا

گجرات، انڈیا

94090 22314

ناشر: مکتبہ احمدیہ

جامعہ حسینیہ راندر

سورت، گجرات، انڈیا۔

99746 04855

از: عبدالحفیظ بن معروف ناظم عبد اللہ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

۵۲	طلب فتویٰ اور دارالعلوم کا فتویٰ	د
۵۳	طلب فتویٰ غلط اقدام تھا	ھ
۵۵	ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی	و
۵۷	وجہ قول معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ	ز
۵۸	افسوس دارالافتاء سے نہ ہو سکا!	ح
۶۰	عدم سبقت ذہن اور تاویلات سے غفلت	ط
۶۱	عدم سبقت ذہن ہی راجح ہے	ی
۶۲	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے سکوت کی وجہ	←
۶۴	منزل انتظار یعنی توجیہات کی جانب	● ●
→	مقام عبرت	●
۶۶	اہل علم حضرات کی توجہ	●
۶۷	علوم اسلامیہ کی وسعت و گہرائی کے شواہد	↔
۶۸	علوم ظاہرہ و علوم باطنہ کی باریک نزاکتیں	۴
۷۰	افتراق بلا تضاد کی پہلی مثال	۱
۷۰	افتراق بلا تضاد کی دوسری مثال	۲
۷۱	افتراق بلا تضاد کی تیسری مثال	۳
۷۴	افتراق بلا تضاد کی چوتھی مثال	۴
۷۵	افتراق بلا تضاد کی پانچویں مثال	۵
۷۶	رجال دین کے اقوال کی توجیہات	۵

فہرست عنوانات

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	ابتدائیہ	۷
۲	عقیدہ، خوف خدا اور عقل کے کردار	۱۰
!!	بندہ کی سادہ بلکہ پاکیزہ سمجھ	۱۲
● ●	داعیہ تالیف	۱۴
؟؟	معترض کا منشا و خیال	۱۵
؟	اعتراض کا پوسٹ مارٹم	۱۶
!!!	تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک	۱۸
!!	دعوت و تبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر	۲۰
!	تاویل و توجیہ کی ایک جھلک	۲۳
؟؟	تاویلات کا راستہ یا اعتراض کا انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے	۲۶
←	دین و شریعت کا ایک مختصر خاکہ	۲۸
؟؟	لوگوں کا ردِ عمل	۳۳
☼	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراض کا حال	۳۵
۱	وجہ اعتراضات	۳۷
ب	تعیین معنی میں خطا کی وجوہات	۴۰
ج	تعیین معنی میں سب سے مقدم اور بہتر طریقہ	۴۳
۳	قابل اعتراض ”رجال دین“ کے چند اقوال	۴۴

۸۷	حضرت مولانا محمد سعد پر ہوئے اعتراضات کے جوابات	☆
۸۸	جوابات سے پہلے انتہائی اہم امور و اصول	۶
۱۰۶	مذہب اسلام کی جامعیت و کمالیت	!!!
۱۰۸	اصول جرح و تعدیل فی الروایہ	۱
۱۰۸	امام میں جرح و تعدیل کی شرائط	ب
۱۱۰	جرح میں تساہل کے اسباب	ج
۱۱۱	نہایت توجہ کے قابل مقام	د
۱۱۲	منع حق "قرآن" کا فیصلہ، فیصلہ حق کے لیے	ھ
۱۱۳	امیر و شوری کی شرعی حیثیت	۷
۱۱۵	شرعاً امیر کا ہونا واجب ہے، یہ اجماعی مسئلہ ہے	۱
۱۱۷	پھر مسلمانوں کے امیر کا صرف ایک ہونا بھی ضروری ہے	ب
۱۱۸	زبردستی امیر بننے والے کی بھی اطاعت ضروری ہے	ج
۱۱۹	حضرت عمرؓ کی بنائی شوری کی حقیقت	د
۱۲۳	حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات	۸
۱۲۴	توجیہات سے پہلے کچھ ضروری نظائر	*
۱۲۵	اعتراض : موبائل سے متعلق اقوال کی توجیہ	(۱)
۱۲۹	اعتراض : حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں تنقیص	(۲)
۱۳۲	اعتراض : ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی	(۳)
۱۴۰	اعتراض : اسباب دنیویہ کی نفی	(۴)
۱۴۲	جدید تعبیر اعتراض کی چیز نہیں ہے	● ●

۱۴۴	اعتراض : اجرت علی التعلیم اجرت علی الزنا کے مثل ہے	(۵)
۱۴۶	تعلیم و تبلیغ میں فرق	● ●
۱۴۸	اعتراض : معجزہ کا سبب دعوت ہے	(۶)
۱۵۰	اعتراض : خروج فی سبیل اللہ فرائض شرعیہ پر مقدم ہے	(۷)
۱۵۱	اعتراض : قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے	(۸)
۱۵۲	اعتراض : فرشتوں کا اورنگ آباد کے اجتماع میں نزول	(۹)
۱۵۴	اعتراض : جو مجھے امیر نہ مانے وہ جہنم میں جاوے	(۱۰)
۱۵۵	اعتراض : بغیر حضور قلب کے ذکر کرنے والا گنہگار ہے	(۱۱)
۱۵۶	اعتراض : حیاۃ الصحابہؓ کے علاوہ کتابوں کو پڑھنے سے روکنا	(۱۲)
۱۵۷	اعتراض : تکمیل توبہ کے لیے اللہ کے راستہ میں نکلنا شرط ہے	(۱۳)
۱۵۸	اعتراض : تنہائی میں گناہ کرنا اصل بے حیائی ہے	(۱۴)
۱۵۸	اعتراض : تمام مسائل کو مرکز لے کر آیا کرو	(۱۵)
۱۵۹	اعتراض : دعوت و تبلیغ کی چھ صفات مکمل دین ہے	(۱۶)
۱۶۰	اعتراض : مشورہ میں حاضری کا اہتمام نماز سے زیادہ ہو	(۱۷)
۱۶۱	آخر میں سب سے اہم بات	!!!
۱۶۱	حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے دینی طرز عمل کی حقیقت	(۱۸)
۱۶۳	عام غلط فہمی کا ازالہ	↔
۱۶۸	مسلم دستور اور دعوت و تبلیغ کے دوزمانے	۹
→	خاتمۃ الکتاب	↔

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دعوت و تبلیغ کا المیہ اس لیے بھی عظیم و حیرت ناک ہے! کہ اس میں پہلی بار کوئی بے نمازی شخص چلہ لگانے پر پانچ نمازوں کے ساتھ تہجد اور مسواک کا اہتمام کرنے لگ جاتا ہے اور خواتین مسجدوں کی جماعتوں کے اوقات اور وہاں کے مشوروں کو جان رکھتی ہیں اور بچے گھر کی تعلیم کی وجہ سے صحابی بننے کی بات کہتے ہیں! ماشاء اللہ۔ لہذا اس بارے میں کوئی بھی قدم خطرہ سے خالی نہیں، وہ ایک پل صراط پر قائم ہونے کی طرح ہے، لیکن اگر کوئی خوش قسمت! اپنے پاؤں میں ”حقیقی دین“ کی پیروی کی زنجیر ڈال کر۔ روایتی دین کی نہیں۔ اور عقل و بصیرت سے پوری طرح لیس ہو کر کوئی قدم اٹھائے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔

پھر بھی اسے خدا کو ”عَلَيْهِمْ بِذَاتِ الصُّدُورِ“ میزان عدل کو ”فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ“ اور اپنی تیاری کو ”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ“۔۔۔ مستحضر رکھنا ہوگا جس میں ذرہ ہے جبال نہیں۔ یہ خیال نہ ہو یہ کاوش خود ”لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ“ کا مصداق ہے۔ بالکل صحیح اگر تالیف کا داعیہ پیش نہ آتا، پھر بھی ہم نے تالیف میں بساط بھر ایسی زنجیر ڈالی ہے جس کی کڑیوں کا مشاہدہ ہر وہ شخص کرے گا جو اپنے نفس کا مالک ہو یعنی سادہ ذہنیت اور عقل و شعور کا مالک ہو اور کتاب کو از اوال تا آخر اور وہ بھی پوری طرح سمجھ کر پڑھے۔ کیوں کہ ہم نے نہ تو کسی پر بے محل، نہ تو حد اعتدال سے ہٹ کر کوئی ایسی انگلی اٹھائی ہے کہ وہ پلٹ کر ہم پر اٹھے۔

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ موقع پر ”حق و صدق“ کا اظہار نہ کیا جائے، پھر تو کام ہی کیا ہوا، دراصل انگلیاں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں، سوائے بقدر استحقاق ”اخ فی الدین“ معترض پر وہ بھی بربادی سے بچانے کے صالح ارادہ سے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُنْفَسِدَ

مِنْ الْمَصْلِحِ۔ اس لیے ہم نے اس نزاعی مسئلہ میں باعث کلفت و ندامت نہ بناتے ہوئے بر سبیل حکمت بڑی شخصیات کی توثیقات کا بھی اہتمام نہیں کیا۔ بس ان وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ۔ ان شاء اللہ۔ یہ کتاب بلا کسی تفریق تمام احباب امت میں مقبول و مفید ہوگی۔ داعیہ کا پیش کیا آنا تھا، وہ ایک خدائی اشارہ تھا بس صالح ارادہ سے کام شروع کر دیا بلکہ ”وَالْقِيَاسُ السَّحَرَةُ سَاحِدِينَ“ کی طرح شروع ہو گیا، پھر تو من و سلویٰ اور بادل کے سایہ کی طرح نہ صرف اس نے ایک انگلی پکڑی، پورا ہاتھ ہی اس قدر تھا کہ حرکت تو قلم کی پر محرک وہ، روشنائی تو قلم کی پر پر تو اس کا!!

مدتوں پہلے کے مضامین دل و دماغ میں مچلنے لگے، ان کا اس قدر فیضان گویا کوئی معلم ہے اور راقم اس کا متعلم۔ اسی وجہ سے تعلیمی مصروفیات ”بالامانت“ کے باوجود کام او آخر ربیع الآخر سے شروع ہو کر او آخر جمادی الثانیہ میں صرف دو ماہ میں اختتام کو پہنچا۔ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ“ کتاب کا خاص مقصد معترض صاحب کو حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے خلاف گمراہی کی تشہیر و اشاعت سے ”علی حد الشرع“ روکنا ہے۔ ملاحظہ ہو داعیہ تالیف ۱۴۔ اگر یہ پیش نہ آتا تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی ان توجیہات کی بھی نوبت نہ آتی جو مدتوں اور سالوں سے دل و دماغ میں تھیں جن کا اظہار رفقاء سے کرتے تھے۔ معترض صاحب کا احسان کہ وہ داعیہ بنیں ان توجیہات کے اظہار کا اور اس کا بھی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ حقیقی احوال اب سامنے آویں۔

ہم نے ان توجیہات کو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش اس لیے کی ہے تاکہ علماء حضرات علمی مہارت کی وجہ سے حضرت کے اقوال کو اچھی طرح سمجھ سکیں، بایں وجہ کچھ لوازمات مباحث بھی شامل ہو گئے، جنہیں فہرست سے سمجھا

جاسکتا ہے۔ اور تیسرا مقصد چوں کہ ہمارے نزدیک اس بارے میں کوئی بھی قصداً بڑا قصور وار نہیں ہے گویا ایک طرح کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے اور لوگ اس معاملہ میں بڑے غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں جو ”زخم پر نمک چھڑکنے“ سے باز نہیں آ رہے ہیں تو پھر لوگوں کو سنجیدہ بننے اور اس بربادی سے بچنے کی راہ بتانے میں زور زیادہ صرف ہوا جو کسی بڑی شخصیات یا کسی عام مسلمان پر تہمت وغیرہ کا لازمہ ہے۔

راقم کا یہ مزاج ہے اور اکثر عوام و علماء حضرات کے بارے میں اس کا کمزور خیال بھی یہ ہے کہ وہ نہ تو براہ راست قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ سے اپنی اصلاح کا خیال اپنے دلوں میں رکھتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے کما حقہ اصلاح و تہذیب سے وہ محروم رہتے ہیں۔ خصوصاً علماء حضرات کو تو اس کا اہتمام تعلیم کے زمانہ سے ہونا چاہیے تاکہ ان کی زندگیوں میں چار چاند لگ جائیں!

نوٹ : قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی خطا پائیں تو آگاہ فرماویں بصد تکریم قبول ہوگی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے خاتمۃ الکتاب صفحہ ۱۷۲ پہلے ضرور پڑھ لیں۔ بعض مقامات پر حوالہ ”بیاض“ ہوگا ضروری نہیں کہ سالوں کے مطالعات کے مصادر بروقت مستحضر ہوں۔ عمدہ تعبیرات کے استعمال میں اگر تحقیر کا رنگ پاویں تو اسے کلام کا حسن و زینت سمجھیں نہ کہ تنافر۔

عبدالحفیظ ایلووی عفی عنہ۔

خادم التدریس جامعہ حسینیہ، راندر، سورت، گجرات، انڈیا۔

۲۸ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ

عقیدہ، خوف خدا اور عقل کے کردار

إِنَّ رَبَّ الْعِزَّةَ جَلَّتْ قُدْرَتُهُ يَسْتَغْنِي عَنِ الْعَالَمِينَ لَا يَنْتَفِعُ بِكَثْرَةِ شُكْرِهِمْ وَلَا يَضُرُّهُ زِيَادَةُ كُفْرِهِمْ۔ ترجمہ: حقیقت ہے کہ رب العزت ”طاقت و غلبہ کا مالک“ جس کی عظیم قدتیں ہیں دنیا والوں سے ایسا مستغنی ہے کہ نہ تو وہ ان کے کثیر شکروں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ تو ان کے کفر کی زیادتی اسے ضرر پہنچاتی ہے۔ ذیل کے مضمون کو غور سے پڑھیے۔

آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہی نہیں جب تک وہ سچائی اور حقیقت کے ساتھ اپنے دل میں یہ عقیدہ نہ بٹھائے ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“ پھر اس عقیدہ میں مزید حقیقت اور پختگی بھرنے کے لیے اسی دن سے خوف خدا لازم کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے اپنے خدا کی قدرت کو ”إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ اس کی خبر اس کے علم کو ”إِنَّهُ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“ ”إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ“ ”يَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ“ سمجھایا جاتا ہے اور اپنی آخرت کے سامان کی یوں فکر دلائی جاتی ہے ”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ“ ”وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ“ یہ خوف خدا جتنا اسلام لانے کے دن ضروری ہوتا ہے اتنا ہی ولایت میں قدم رکھنے کے دن اور زندگی سے آخرت کی طرف سفر کرنے کے دن بھی ضروری ہوتا ہے۔

اسلام نے ہر قسم کے انسداد جرائم کے لیے اور تمام قسم کے کمالات کے حصول کے لیے اسی کو بنیاد بتایا ہے ورنہ اس نے نہ تو پولیس محکموں اور عدالتی محکموں پر مکمل اعتماد کیا ہے اور نہ ظاہری تدین و عبادت گزاری پر مکمل اعتماد کیا ہے، بلکہ اسی خوف خدا پر اعتماد کیا ہے، کیوں کہ اگر یہ ہے تو آدمی ہر قسم کے گناہ سے بچ سکتا ہے چاہے گناہ کرنے کے سارے سامان ہوں اور اگر یہ نہیں ہے تو وہ عبادات و اخلاق کے سنہری پردوں میں بھی گناہ سے نہیں رک سکتا۔ خلاصہ یہ کہ اندر

کا انسان اور اندر کی اصلاح ہی اصل اصلاح ہے پہلے دن بھی اور آخری دن بھی۔

مذکورہ باطنی پختہ نظام کے ساتھ انسان کو ایک اور جوہر سے نوازا جسے اپنے اس نیک عزائم میں معاون بنا سکے وہ ہے عقل کا جوہر۔ یہ خدائی بڑی نعمت ہے، اسی جوہر سے آدمی ترقی کے ممتاز مدارج طے کرتا ہے اور اس کے غلط استعمال سے ایسے فحش و فساد میں جا گرتا ہے جس کا تصور خود اسے اس کے غلط استعمال سے پہلے نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسے قرآن حکیم نے ”نہلی“ کہا ہے یعنی ہر قسم کی ذلت اور ہر قسم کے ضرر سے بچانے والی۔ بلکہ عرب کے فصیح و بلیغ شعراء نے اسے ”صواب“ اور ”حق“ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اسلام نے بھی ایک درجہ میں اس کو ”حجت“ کا مقام دیا ہے۔ انسانی افراد ہوں کہ ان کا مجموعہ اور جماعتیں ان سب کے ناپنے کا صحیح معیار یہی ہے، اسی سے جماعتیں اور معاشرے بگڑتے بھی ہیں اور سنورتے بھی اسی سے ہیں۔

اس جگہ عقل کا تذکرہ اس اہم مناسبت سے ہے کہ بسا اوقات ”بظاہر بڑے“ آدمی سے بوجہ غلبہ خوف خدا اثر اور فساد کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا لیکن جب وہ اپنے بلند مقام پر اس کے تقاضہ کے مطابق اپنے کاموں میں عقل سلیم کا استعمال نہ کرے تو پھر خوف خدا کے باوجود اس سے شر و فساد کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی طرف توجہ دلائی ہے ”إِنَّمَا فَخِئْضٌ مُّضِلٌّ ۖ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ“ (سورۃ بقرہ ۱۲)

لیکن یہ پورا نظام یعنی اسلام کا اولیٰ عقیدہ، خوف خدا اور انسانی عقل و نظر سب ہی ایسا باطنی ”نظام“ ہے کہ صاحب معاملہ اور خدا کے سوا ”فِيْمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللّٰهِ“ کوئی نہیں جانتا، اس کا حقیقی علم صرف خدا کو ہے اس لیے کوئی کسی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ تزکیہ کر سکتا ہے نہ اس پر کسی برائی کا الزام دھر سکتا ہے ہاں اس کے اندازے کی کچھ علامات ہیں لیکن ان کا درجہ بس علامات کا ہے۔

یہی ایک اہم وجہ ہے جس کی وجہ سے ہندو بیرون ہند بڑے بڑے علماء کرام ”دعوت و تبلیغ“ میں زیادہ مداخلت کرنے سے گریز کر رہے ہیں، ورنہ ان کے پاس علم کی کمی نہیں، بس وہ احتیاطی تدبیر کے ترجیح کے قائل ہیں، اس لیے کہ یہ بڑی پرخطر گھاٹی ہے۔ راقم بھی حتی الامکان اسی کے حق میں تھا۔ لیکن ایک داعیہ ایسا پیش آیا جس کے بعد اس میدان میں قدم رکھنا مذہبی فریضہ سمجھا اور یہ مختصر سالہ مرتب کیا۔ اس داعیہ کی تفصیل سے پہلے کچھ پیش آمدہ مسئلہ پر روشنی پڑ جائے۔

بندہ کی سادہ بلکہ پاکیزہ سمجھ

بندہ کی سمجھ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ”بظاہر“ کوئی بھی شخص قصداً بڑا قصور وار نہیں۔ نہ حضرات ارباب شری، نہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم اور نہ تو حضرات علماء دیوبند۔ پھر بھی یہ مسئلہ بڑی حد تک نزاعی بن چکا ہے، ہمارا خیال ہے یہ ایک طرح کی ”اجتہادی“ خطا ہے (واللہ اعلم) اور ہر کوئی جانتا ہے ایسے مسئلہ میں اس مفسدہ، فتنہ اور خرابی سے نکلنے کی صحیح راہ یہی ہے کہ ہر ایک کا بے قصور ہونا واضح کیا جائے، لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں کہ مجھ جیسا شخص اسے انجام دے ”صاحب البیت ادریٰ بمافیہ“ خصوصاً مذکورہ بالا باطنی نظام میرے لیے مانع ہے کہ میں اس پر کچھ تحریر کروں جس کے پاس اس کی علامات تک کا علم نہ ہو۔

اس مسئلہ کا اگر کوئی شخص صحیح معنی میں تجزیہ کرنا چاہے تو اس کے بنیادی ۳ بڑے اجزاء پر سیر حاصل مباحث پیش کرنے ضروری ہوں گے۔ ایک حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے متعلق۔ دوسرے حضرات ارباب شری کے متعلق۔ اور تیسرے از ہر الہند دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کے متعلق۔ جن میں اسے ذیل کے گوشوں پر مباحث فرمائی ہوں گی۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب : انہوں نے چند باتیں ایسی کہی جو باعث تشویش ہیں۔

حضرات ارباب شوری : سب سے پہلے تشویش کا اظہار انہوں نے کیا، ورنہ دارالعلوم نے تو فتویٰ بعد میں صادر کیا، صرف اظہار نہیں جائز حد تک مولانا کو اس سے روکنے کی کوشش بھی کی، کیا دفع تشویش کے لیے یہی ایک راہ تھی کہ اور بھی کوئی راہ مثلاً ان اقوال کا صحیح ہونا تھی یا نہیں، نہیں تھی تو صرف ان ہی کے پاس نہیں تھی کہ دوسروں کے پاس بھی نہیں تھی، مان لیا نہیں تھی تو مرکز چھوڑنے کا یہی ایک حل تھا کہ کوئی اور بھی حل ہو سکتا تھا، اگر چھوڑا بھی تو اس میں جماعت کیسے بنی؟ ہر شخص اپنا فیصلہ بھی تو لے سکتا تھا، جو بھی ہوا اب ان کا طرز عمل کیسا ہے؟ مثبت کے منفی؟

ہمارے دارالعلوم کا فتویٰ: از ہر البند دارالعلوم نے از خود فتویٰ صادر کیا کہ لوگوں کی مراجعت کے بعد، فتویٰ شرعاً صحیح ہے کہ غلط، اگر غلط ہے کیوں کہ امکان خطا ہر جگہ ہوتا ہے تو اس کا اظہار ہوا کہ نہیں، اگر صحیح ہے تو کیا فتویٰ صادر کرنے کے علاوہ اس کے پاس یا اس کے ذمہ شرعی کوئی اور بھی حل ہو سکتا تھا جس سے مسئلہ کو اس حد تک جانے سے روکا جاسکے یا حل نہیں تھا، فتویٰ مرتب کرنے میں ”باوجودیکہ وہ نفس استفتاء کے مقابلہ میں صحیح ہے“ پوری امانت داری کا خیال رکھا گیا ہے یا کسی جانب کا دخل ہو گیا ہے، اور جن علماء حضرات کی دستخطیں ہونیں ہیں وہ طوعاً ہوئیں کہ اس میں کرباً ہونے کا بھی دخل ہے۔ یہ سارے احتمالاتی گوشے تفصیل طلب ہیں۔ اگر کوئی منصف اور معتدل مزاج تجزیہ کرنا چاہے تو غالباً اس پر ان سارے گوشوں پر مباحث پیش کرنے کی ذمہ داری

داعیہٴ تالیف

واعیہ کی تفصیل سے پہلے راقم اپنا حال بتا دینا چاہتا ہے بوجہ تقاضۂ حدیث شریف ”فَانْظُرُوا عَنْ مَنْ تَأْخُذُونَ دِينَكُمْ“ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے صرف تعلیمی مصروفیات ہی میں نہیں رکھا، تالیف کا کام بھی لیا جس تالیف پر بڑے حضرات نے لفظ ”تصفیف“ استعمال فرمایا۔ مزاج میں سادگی ہے عامتہ جو طلب جاہ و مال کا رنگ و ڈھنگ دیکھا جاتا ہے اس سے اللہ نے بہت ہی دور رکھا ہے دین و علم کے معاملہ میں حقیقت پسندی کا جو ہر نمایاں وصف ہے، عبادت گزاری یقیناً بقدر کفاف ہے لیکن دین و ایمان اور علم و بصیرت کو اپنا متاع عزیز تصور کرتا ہے۔ زندگی میں کسی کو قصدِ تکلیف و ایذا نہیں پہنچائی اور حب مسلم اور اس کے اکرام کا جذبہ زیادہ ہے یا خلوص للہیت کا یہ فیصلہ از خود نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ فلله الحمد اولاً
وَآخِرًا “فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ الْمُوفِيُّ وَالْحَادِي” تو آئے ہم اس رسالے کے تالیف کا داعیہ کیا ہے وہ بتاتے ہیں۔

نوٹ: ہم پوری کوشش کریں گے کہ بات مثبت انداز میں کہیں اور بنظر انصاف کہیں لہذا آپ حضرات بھی بنظر انصاف پڑھیں اور دین و شریعت کو اور عقل و میقظ کو شاہد رکھیں۔ لہذا مسئلہ کو اعتدال پر لانے کے لیے جب ہماری کوئی بات کسی کی موافقت میں یا کسی کی مخالفت میں معلوم ہو تو اس وقت آپ کو بہکنا نہیں ہے، وہ نہ بجا کسی کی موافقت ہوگی نہ مخالفت وہ اعتدال پر لانے کی ایک راہ ہوگی۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد سعد کی موافقت مشکل گھاٹی ہوگی کیوں کہ مسئلہ وہیں

راقم کی عادت نیٹ اور واٹ ساپ چلانے کی نہیں ہے اور نہ اس کی خاص جانکاری ہے جس سے کافی حد تک الحمد للہ مذکورہ خرابیوں سے اپنے آپ کو بچا رکھا تھا۔ لیکن ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ کے بالکل آخری دنوں میں مطابق ۲۸ دسمبر ۲۰۱۸ء کو عربی زبان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ۷۰ اعتراضات کو تحریر کر کے کئی اوراق ”جناب حنیف شاہ زاہد شاہ صاحب کے“ جو پونہ شہر مہاراشٹر کے سپوت ہیں ہمارے مدرسہ ”جامعہ حسینہ راندر، سورت، گجرات“ کے دفتر میں ارسال کردہ پہنچے۔ موصوف عالم فاضل بھی نہیں بس انہوں نے اپنا تعارف ”اسلامی اسکالر“ بتایا ہے۔ وہ اوراق بندہ تک پہنچے۔

معترض کا خیال و منشأ

یاد رہے کہ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم نے ہندوستان کے ہر بڑے دینی ادارے کو یہ اعتراضات بھیجیں ہیں اور تقاضہ کیا ہے کہ ہر ادارہ دارالعلوم دیوبند کی تائید و توثیق میں اپنا توثیق نامہ پیش کرے تاکہ خصوصاً عرب اسلامی ممالک اور دیگر بیرون ممالک کو آگاہ کیا جائے کہ ”مولانا محمد سعد“ گمراہ ہیں جس کی شہادت پر داخل ملک کے یہ سارے دینی ادارے متفق ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اس کا اصل تعلق تو ادارے کے منتظمین اور دارالافتاء سے تھا۔ لیکن ہمارے

۱۔ اگرچہ معترض ”اخی فی الدین“ صاحب نے صریح گمراہ کا لفظ استعمال تو نہیں کیا تاہم ”اَلْکِنَايَةُ اُبْلَغُ مِنْ الصَّرِيحِ فِي التَّأْثِيرِ“ کے بموجب ان کے یہ جملے ”اقوال فاسدہ، عقائد باطلہ، اور امت کو گمراہی سے بچانا، لوگوں کو ان سے اور ان کی باتوں سے دور رکھنا، پوری طرح اس پر دال ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی بعض جگہوں پر اسی کو سامنے رکھ کر اسے دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادارے کے منتظمین نے توثیق نامہ ارسال کرنے کے بہ جائے سکوت کو ترجیح دی ہے۔ لیکن جب بندہ نے ان کو پڑھا تو اپنے ذاتی طور پر رسالہ کو مرتب کر کے مسئلہ سے لوگوں کو واقف کرنا مناسب سمجھا۔

کیوں کہ جناب موصوف صاحب ”اخی فی الدین“ نے علی حدہ کاغذ ”برائے اردو دارالافتاء“ میں لکھا ہے کہ ”کنول اجتماع صرف حکومت کے دس کروڑ روپیوں سے انجام پایا اور مولانا محمد سعد صاحب نے تبلیغی جماعت کو دشمنوں کے ہاتھ بچ دیا“ اور یہ بھی کہ ”مولانا محمد سعد“ کے پیچھے ان یٹھ عوام کی ایک بھیڑ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور عربی اوراق میں تو تہمت بازی دکھائی ہے مثلاً ”مولانا محمد سعد“ نے دعوتی طریقہ کو اپنی اور اپنی اولاد کی میراث قرار دیا۔ دیگر مشائخ تبلیغ کو ڈرایا دھمکایا، شریر لوگوں کو ان کے مخالفین کی پٹائی کا حکم دیا، وہ ہر معاملہ میں آزاد ہو گئے ہیں، اپنی طرف سے چند نئے احکام اور مشکوک نہج وضع کیا، قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی، نئی تعبیرات اور شاذ تفاسیر اختیار کیں جس کی وجہ سے انہیں دارالعلوم دیوبند نے اقوال فاسدہ و عقائد باطلہ سے روکا اور ان پر گمراہ ہونے کا خوف ظاہر کیا تو ہم نے دارالعلوم کا سہارا لے کر شیخ سعد کے خلاف جوابات طلب کیے غور کی بات یہ ہے کہ اس پر کسی بھی عالم دین کا نہ نام ہے اور نہ دستخط، معلوم ہوتا ہے یہ کاوش خود اہل السنہ والجماعہ کے مخالف ہے۔

اعترض کا پوسٹ مارٹم

اولاً تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خیانت کی ہے۔ کیوں کہ دارالعلوم نے اپنے اعلان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قابل اعتراض جو اقوال بیان کیے ہیں مثلاً

موسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ، توبہ کی شرط، وہاں ہدایت کا وہ قول نہیں بتایا جو ان اوراق میں اور وہ بھی سر فہرست بتایا ہے وہ یہ کہ ”اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہدایت نہیں ہے“ موصوف نے تو یہ بتایا جب کہ دارالعلوم نے یہ لکھا ہے ”ہدایت ملنے کی جگہ مسجد کے علاوہ کوئی نہیں“ اور اسے تیسرے نمبر پر بتایا ہے اس کو دیکھ کر تو ان پر خیانت کا شبہ ہی نہیں خیانت کا الزام درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو حال تھا تحریری ثبوت کا۔ رہا مسئلہ مولانا کی زبان سے بذریعہ نیٹ سننے کا تو اس میں بھی خیانت ظاہر ہو رہی ہے وہ آپ حضرات ”مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات“ کے عنوان میں اعتراض نمبر تین میں ملاحظہ فرمائیں جس کی کلپ انہی سے منگائی تھی اور بندہ نے سنا تھا۔ دارالعلوم کے بتائے ہوئے میں اور موصوف کے بتائے ہوئے میں کتنا شدید فرق ہے آپ سمجھ سکتے ہیں اگر وہ ہی تھا تو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے پھر تو دارالعلوم کو اسے نمبر اول پر بیان کرنا چاہیے تھا۔

ہم یہاں ان کی دو باتوں کو لے کر سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلی بات انہوں نے لکھی ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ ان پڑھ لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ یعنی علماء ان کا ساتھ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اولاً تو اس کے جواب میں انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت مولانا نہ اپنی ذات کے لیے کسی کا ساتھ چاہتے ہیں نہ کسی کے ساتھ کا انکار کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اس کی صحیح طلب پر توفیق بخشے وہ ساتھ ہے اور پورے طور پر ساتھ ہے ورنہ اپنے معاملہ کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ رہا ان کا اس لیے ساتھ دینا کہ ان کا وہ ”نچ“ ”نچ امارت“ جس کو معترض نے مشکوک کہہ کر مجروح کیا ہے باوجودیکہ وہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ عین شریعت کے موافق ہے بلکہ ”نچ امارت“ ہی صحیح ہے، نہ کہ ”نچ شوری“۔

اسی طرح ان کے علم و عمل، زہد و تقویٰ اور ان کے اقوال کی صداقت و حقانیت کی وجہ سے ان کا ساتھ دینا اور اس کو ثابت کر کے پیش کرنے میں ان کا ساتھ دینا وغیرہ تو وہ سمجھ لیں آج

بھی ایسے علماء موجود ہیں جو ان سب کو ثابت کرنے کے ساتھ آپ کے مدعی کو باطل ثابت کر کے آپ جیسوں کی ناعقلی و لاعلمی پر ماتم کرنے کے دلائل اپنے دامن علم میں رکھتے ہیں اور اس کی وجہ رکھتے ہیں کہ آپ کا یہ اقدام ”گمراہی نہ سہی“ خود ایک غیر شرعی ہے یا کم از کم فتنہ انگیزی اور ناعاقبت اندیشی تو ضرور ہے کیوں کہ اس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی گمراہی کی تشہیر گھر گھر جا کر کرنے کا حکم ہم سمجھتے ہیں نہ ارباب شوریٰ نے دیا ہو گا نہ دارالعلوم دیوبند نے تو پھر آپ یہ خواب دیکھنے سے دور رہیں کہ ہر کوئی آپ کا ساتھ اندھی تقلید کرتے ہوئے دے گا۔ دوسری بات کہ کرنول اجتماع میں۔۔۔ اس کا جواب آپ ”دعوت و تبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر میں“ دیکھ لیں۔

تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک

دعوت و تبلیغ کا یہ کام اپنے حیرت انگیز کارناموں میں اور احیاء دین و ایمان کی تاثیر میں تمام تنظیموں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے بلکہ اس نے اس بارے میں ہدایت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ جس کی تفصیل آگے دین و شریعت کے خاکہ میں آرہی ہے۔

یہاں ہم ایک عالم دین سے سنی ایک بڑی عبرت کی بات بتانا مناسب سمجھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ہم اسلام کے دیگر باطل فرقوں کے وجود کو قبیح و ناپسند سمجھتے ہیں لیکن وہ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ حب نبی اور حب اولیاء کے زعم و عقیدہ میں اور قبر بوسی کے عمل میں اسلام کے نام لیوار ہے اسلام پر جے رہے جس سے وہ کفر و شرک کی غلاظت سے محفوظ رہے۔ چاہے نہ ان کا عقیدہ درست تھا نہ ان کا عمل، لیکن اس غلط عقیدہ و عمل نے کفر و شرک کی گھاٹیوں سے بچا کر انہیں اسلام نما بنائے رکھا۔

دوسری طرف خود اہل حق مسلمانوں کے ایمان و یقین سے حقیقت رخصت ہو چکی ہے

وہ مردہ بن چکے ہیں، ان کے دین و یقین میں بھی حقیقت روح پیدا کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور دعوت و تبلیغ کا کام جاری فرمایا۔ جس سے ایک طرف اہل حق مسلمانوں کے دین و ایمان میں جان پڑی بلکہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نامسلمان، مسلمان بنیں۔ تو دوسری طرف ان باطل عقیدہ مسلمانوں کو بھی بلا کسی تفریق ”ایمان و نماز کی“ دعوت دے کر نہ صرف ان کے باطل عقائد و اعمال کی حکمت سے اصلاح کی بلکہ ان کے بازوئے دین و ایمان کو مضبوط بھی کیا۔ آج لاکھوں مبلغین ایسے موجود ہیں جو ان باطل عقائد سے ہجرت کر کے حق کی طرف آئے اور آج خود بھی حق پر قائم ہیں اور دوسروں کو حق پر لانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس میدان میں کام کا قرعہ فال نہ مدارس کے نام نکلا، نہ خانقاہوں کے نام، نکلا تو صرف دعوت و تبلیغ کے نام!! دعوت و تبلیغ کا یہ کارنامہ ”تاریخ“ میں ایک مثال بن کر یاد کیا جائے گا۔ یہ پہلو تو اس کے اپنے ماننے والوں کے بارے میں تھا۔ لیکن اپنے دائرے سے باہر آ کر جھانکیں تو وہاں بھی اس کا حال عجیب سا ہے۔۔۔

یہ ایسی عظیم ترین تحریک ہے کہ پوری دنیا میں خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مذہبی زہر اگلا جا رہا ہے، ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کے جارحانہ حملے کیے جا رہے ہیں اور مذہبی کتاب، عبادت خانوں کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں ۶۰/۵۰ سال کے عرصہ میں قومی تصادم کے سینکڑوں واقعات پیش آئے اور آتے رہتے ہیں۔ اور ملکی غیر ملکی طاغوتی طاقتیں، مختلف قومی حکومتیں ان کا نام و نشان مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں ان پر غلط جہاد کے الزام دھر کر انہیں کٹھرے میں کھڑا کر رہی ہیں ان کی ایک ایک نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس عظیم تحریک پر ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی آنچ نہیں آئی، آج تک اس پر اندرونی اور بیرونی کوئی انگلی اٹھ نہیں سکی۔ آخر کیوں؟

یہ بیرونی حال تھا جب دونوں طرح کا حال یہ ہے تو پھر یہ کہنا بجا ہوگا کہ دعوت و تبلیغ تاریخ اسلام کی ایک عظیم ترین تحریک ہے۔ اس کی کوئی نظیر پوری اسلامی تاریخ میں نایاب ہے ہماری سمجھ کہتی ہے اب اگر کوئی مؤرخ تاریخ اسلام کو قلم بند کرے گا تو اس تحریک کو سرفہرست لکھے گا۔ یہ ایک کامیاب بے مثال، بے داغ تحریک ہے۔ اس کا روشن چراغ سخت تیز ہواؤں کے جھونکوں میں عالم کو منور کر رہا ہے، اس کی روشنی صحراء دریا اور چھوٹے بڑے جزیروں اور دیہات و شہر اور گلی درگلی جگمگا رہی ہے۔

دعوت و تبلیغ پر حقیقت کی ایک نظر

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا کہ آج تک محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دنیائے کفر و شرک اور فرق ضالہ یہود و نصاریٰ تو کیا، دنیائے اسلام کے دیگر فرقے بھی اس کے کسی عیب پر انگلی نہیں رکھ سکے اور اس کی مخالفت نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ اس تحریک کے اپنے سنہرے اصول ہیں مثلاً چھ نمبر، خود کے جان و مال کی شرط، خود پر نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، بے غرض بن کر کام کرنا، صرف رضاء الہی کی نیت رکھنا، دنیا کو حقیر سمجھ کر کرنا، آخرت کو دلوں میں اس طرح اتارنا کہ وہ نگاہوں کے سامنے ہو جائے، زبانوں پر ہمیشہ ایک ہی صدا ”اللہ ہی کرتے ہیں“ رکھنا، اپنے قیام کی جگہ مسجد کو بنانا، اپنے امیر کے نہ صرف حکم پر بلکہ اس کے اشاروں اور منشوں کو جان کر ان کو پورا کرنا، اور بطور خاص ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر اجتماعی و انفرادی طور پر تنہائی میں اور مجمع میں دعائیں کرتے رہنا یہ سمجھ کر کہ بس سارے کام صرف اللہ کے کرنے سے ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات نماز کے بارے میں یہ جملہ کہہ کر اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا ”ہماری نمازوں سے ہمارے مسائل اللہ تعالیٰ حل فرمائیں وغیرہ کتنی بڑی بات ہے!!

اب بتائیے کہ جو کوئی جماعت اس طرح کام کرے اس سے کون ٹکرائے گا، ٹکرانے کا سوال تو دور کی بات لوگ پروانوں کی طرح کھینچ کھینچ کر چلے آتے ہیں اغیار بھی ان کی مدد کے لیے قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں جن کو یا تو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا تو ضرور ہوگا۔ جس میں ایک کڑی شرط ہے خود کی جان خود کا مال، تبلیغ کا یہ ایسا نعرہ ہے۔ اللہ اکبر۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اگر مالدار ہوتا ہے تو لوگوں پر اس طرح خرچ کرتا ہے جس طرح وہ اپنے بال بچوں پر اور اپنی ذات پر، اگر غریب ہوتا ہے تو بقدر کفاف اپنی ذات پر خرچ کے بعد بابقیہ کو اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے باوجودیکہ ساتھی خود مالدار اور خوش حال ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ ایک چلہ میں ایک ایک لاکھ روپے خرچ کرتا ہے۔ وجہ خدا پر توکل ہوتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم معترض کے دوسرے جز کا جواب دیتے ہیں۔ معترض نے کہا تھا کہ ”کرنول اجتماع میں حکومت کے دس کروڑ روپے لگے“ کیا آپ کو سفید جھوٹ صاف الزام تراشی نظر نہیں آرہی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کام کی بنیاد ہی خود کی جان و مال کے خرچ پر ہے اور تب ہی تو اس کے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں، جو شخص بھی اس کام کی فطرت کو جانتا ہوگا اس قول کی تکذیب کرے گا، اس کام کی خمیر جاننے والا یقیناً یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر بہت بڑا الزام ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں درست سمجھ عطا فرمائیں۔

سوچئے تو صحیح ہمارے یہاں عرف ہے معاملات میں جب کوئی کسی پر چند روپیوں کا الزام لگاتا ہے تو سامنے والا شخص فوراً ملزم سے ثبوت طلب کرتا ہے کہ کیا ثبوت اور کیا دلیل ہے کہ تمہارے مجھ پر اتنے روپے ہیں؟ یہ حنیف شاہ صاحب اتنے نا سمجھ ہیں کہ اتنے بڑے الزام میں انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی، عرف کو بھی بھول گئے۔ کوئی سمجھ دار شخص اگر اتنا بڑا الزام غلط ہی

سہی لگاتا تو وہ اس دعویٰ پر دلیل پیش کرتا چاہے غلط اور جھوٹی ہی سہی۔ جب اس ایک مسئلہ میں ان کا یہ حال ہے تو اور مسئلوں میں کیا حال ہوگا!! جیسے دعوت کے اصول میں بتایا کہ خود کی جان اور خود کا مال شرط ہے، عام مسلمانوں پر بھی اعتما نہیں کرایا گیا۔ اسی وجہ سے تو اسباب کی شدت سے نفی کی جاتی ہے۔ کہ مسلمانوں سے چندہ لے کر کام کیا جائے، سوچنے کی بات ہے کہ جب اتنا احتیاط ہے بھلا وہ کام کب اس کی اجازت دے گا کہ غیروں کے مالوں کی طرف یا حکومت کی طرف نظریں اٹھائی جائیں۔ اور وہ بھی ایسی حکومت جس کا حال بچہ بچہ جانتا ہے۔ جناب حنیف شاہ صاحب میں ذرہ بھی عقل ہوتی تو یہ بات ہرگز نہ کہتے یہ تو ایسا ہے کہ بارش سے بھاگے تو پر نالے کے نیچے کھڑے ہو گئے، اٹھے تھے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراض اور الزام لگانے لیکن انہوں نے تو خود کام ہی پر الزام لگا ڈالا بلکہ تبلیغی حالات کے پردہ میں خود دار لعلوم دیوبند کو کمزور و بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ یہی حال ہوتا ہے جھوٹ اور خیانت والوں کا ”واللہ خیر حافظاً“۔

ہائے افسوس! جو کام دنیا کے کفر و شرک اور یہود و نصاریٰ نے نہیں کیا کہ وہ بھی اس کام کو اور کام کرنے والوں کو بری نظر سے نہیں دیکھتے وہ آج خود مسلمان نے کیا۔ شعر

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی	جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دل کے پھپھو لے جل اٹھے سینے کے داغ سے	اس گھر کو آگ لگی گھر کے چراغ سے

جب ہم نے دیکھا کہ یہ صاحب حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی گمراہی کی اشاعت میں لگن ہیں باوجودیکہ ہمارا دین اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ تو پھر ہم نے ارادہ کر لیا کہ ایک رسالہ مرتب کیا جائے جس میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر عائد ہوئے اعتراضات

کو ان کے اقوال کی توجیہات و تاویلات پیش کرنے کے ذریعہ دفع کیا جائے اور انہیں اس غلط اقدام سے روکنے کی کوشش شرعی طور پر کی جائے۔ یہی ہمارا اولیٰ مقصد ہے۔

دوسرا عظیم مقصد حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات پیش کرنا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ حقیر بندہ دینی تینوں شعبوں ”مدرسہ، خانقاہ اور تبلیغ“ سے منسلک ہے اپنا پیر بھی رکھتا ہے لیکن دعوت و تبلیغ کو بہ چند وجوہ ترجیح دے کر اوقات بھی خرچ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے گاہے گاہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ بیانات بھی سنتا ہے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۹۷ء سے شروع تھا لیکن گنجائش وقت کے درجہ میں۔ جب سننے کے دوران کوئی بات تشویش کی آجاتی تو ابتداءً وحشت تو ضرور ہوتی لیکن اس کے غلط ہونے کا تصور تو کبھی بھی کثرت کتب بینی سے حاصل اس علم سے جو خدا نے اس کے دامن میں سجھایا اور دل میں آراستہ کیا ہے پیش نہیں آیا۔ بلکہ جب جب اس منزل میں قدم آگے بڑھتے گئے پھر تو ”کُلَّمَا إِذَا دَاذِدَتْ يَقِينًا وَذَوْقًا“ بایں وجہ مذکورہ اقوال کی توجیہات پیش نظر تھیں لیکن کسی حد تک معاملہ میں قدم رکھنے کی شدید ضرورت نہ سمجھی، لیکن داعیہ تالیف جب پیش آگیا تو تصور کیا کہ ”خدائی اشارہ آگیا“ تو پھر یہ رسالہ مرتب کیا۔ آپ اگر ان کی توجیہ کو بعید از امکان اور محال سمجھتے ہیں تو ہم صرف اس کی ایک جھلک دکھاتے ہیں کام تو اپنی منزل پر ہوگا اس پر غور کیجیے۔

❦ تاویل و توجیہ کی ایک جھلک ❦

یہ ایک مثلاً توجیہ ہے جسے ہم بطور پیش خیمہ پیش کرتے ہیں۔ فقہ کے احکام سے ہر شخص واقف ہے کہ اس میں ساری اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً فرض، واجب، حرام، ناجائز وغیرہ۔ لیکن آپ ذیل کی اصطلاحات پر غور فرمائیں۔

علم کلام : فقہ کی طرح علام کلام میں بھی واجب اور جائز وغیرہ مستعمل ہیں۔ مثلاً ”رُؤْيَةُ اللَّهِ تَعَالَى جَائِزَةٌ فِي الْعَقْلِ وَوَاجِبَةٌ بِالنَّقْلِ“ (شرح عقائد ۵۶، ۵۸) اسی طرح ”وَمَا هُوَ أَصْلَحُ لِلْعِبَادِ فَلَيْسَ ذَلِكَ بِوَاجِبٍ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى“ (۷۵) اسی وجہ کے استعمال پر علامہ تفتازنی رحمہ اللہ تعالیٰ کو تعجب ہے فرمایا ”ثُمَّ لَيْسَتْ شَعْرَتِي مَا مَعْنَى وَجُوبِ الشَّيْءِ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى إِذْ لَيْسَ مَعْنَاهُ اسْتِحْقَاقُ تَارِكِهِ الذَّمُّ وَالْعِقَابُ“ (۷۶) مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہونے میں فریقین متفق ہیں اس کے مطلب میں غیر متفق۔

نحو و صرف و ادب : ”وَفِي هَذِهِ الْأَفْعَالِ (افعال قلوب) لَا يَجُوزُ الْإِقْتِسَارُ عَلَى أَحَدِ الْمَفْعُولَيْنِ“ (شرح مآۃ عامل ۵۶) صرف میں کہا جاتا ہے یہاں ابدال واجب ہے اور وہاں جائز۔ ادب میں ”كَأَنَّهُمْ يَرَوْنَ مِنَ الْوَاجِبِ أَنْ يُبَدِّلُوا مَا يُقَالُ لَهُمْ“ (قصص النبیین ۹۶/۳)۔ ان سب میں واجب، جائز اور ناجائز کا استعمال ہوا ہے۔ کیا ان مصنفین پر اعتراض کریں گے؟ یا ان مفسدوں سے نکلنے کے لیے کوئی تاویل کریں گے۔ یقیناً تاویل و توجیہ ہی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا بس اسی طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراضات سے بچنے کا راستہ ہے ایسا نہیں کہ ان کی توجیہ ہی نہ ہو۔

ایک اور مثال : ہم اپنے مدارس میں اسباب علم بتاتے ہیں مثلاً استاذ، کتاہیں، کلاس وغیرہ کا ادب و لحاظ کرنا اور ذوق سے مطالعہ کرنا۔ صاحب عقائد نسفیہ اسباب علم بتاتے ہیں : ”وَأَسْبَابُ الْعِلْمِ ثَلَاثَةٌ الْخَوَاشِ السَّلِيمَةُ وَالْخَبْرُ الصَّادِقُ وَالْعَقْلُ“ (شرح عقائد ۱۰) دیکھیے دونوں اسباب کے مفہوم میں کتنا فرق ہے!! لیکن اعتراض کی کوئی بات نہیں اس کی توجیہ

ہے۔ وہ ان شاء اللہ سارے مضامین پڑھنے سے سمجھ آجائے گی۔ یہ سب چیزیں غیر شرعی ہیں اور غیر شرعی چیز کو واجب یا جائز یا ناجائز کہنا شریعت میں مداخلت ہے اور حرام ہے بلکہ کفر کا بھی باعث بن سکتا ہے۔ اعتراض بنانا چاہیں تو اتنا بڑا بن سکتا ہے۔ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ یہ الگ الگ فن کی بات ہے اگر فقہ کے منصب پر رہتے ہوئے ان پر ان اصطلاحات کا اطلاق کیا جاتا تو مسئلہ بگڑتا لیکن منصب فقہ اور میدان فقہ سے ہٹ کر کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس جواب کو ذہن نشین رکھنا ہے۔

اسی طرح آپ ہمارے اعتراض کا جواب دیجئے اور وہ عین حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گئے یا ہوئے ”ہدایت اگر اللہ کے ہاتھ میں ہوتی“ کے بالکل موافق ہے۔ سوال ہے کہ گمراہی کس کے ہاتھ میں ہے؟

ایک : اگر آپ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو ”وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ“ (پ ۱۶) شاید قرآن کی اس آیت کا آپ انکار کر رہے ہیں اور قرآن شریف کی آیت کے انکار کا اگر فتویٰ بس اتنا ہی طلب کریں تو صاف جواب آئے گا کہ ”قرآن کی آیت کا منکر کافر ہے“۔

دوم : اگر آپ کہیں کہ گمراہی سامری کے ہاتھ میں ہے تو بھی بظاہر فتویٰ یہی آئے گا کہ آپ کافر ہیں حالانکہ ”بظاہر“ آپ یہ بھی قرآن ہی کی بات کہہ رہے ہیں کیوں کہ قرآن ہی کی آیت شریفہ ہے کتنا سنگین حال ہے اور کتنا سنگین اعتراض ہے۔ اب بتائیے کہ آپ اس کو لے کر ”دارالافتاء جائیں گے“ جس کا صاف جواب دونوں صورتوں میں وہی ہے جو ہم نے بلا کسی تفصیل کے بتا دیا۔ یا آپ کسی عالم دین صاحب بصیرت شخص سے توجیہ و تاویل طلب کریں گے تاکہ آپ کا دین و ایمان سالم رہے!!۔ معلوم ہوا کہ سنگین سے سنگین قول کی بھی تاویل ہو سکتی

ہے جب اس کا عمل ”امکان“ کا ہو۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال امکان کی حد سے خارج نہیں بلکہ ہمارے تمثیلی اعتراض سے بھی شدید نہیں پھر ”ضلالت“ کیسی؟؟؟
لہذا ہم آپ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رفیق سفر بن کر چلیں تو آپ اپنا زور اور اخلاقیات اور آپ کا زور اور دو چیزیں ہیں ایک نظر انصاف دوسرا تہقیق۔ کیوں کہ جب کوئی شخص کوئی مخصوص نظر اور مخصوص نظریہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ حق و صدق تک نہیں پہنچتا پھر اسے نہ حق سمجھ میں آتا ہے نہ حق دکھائی دیتا نہ حق سنائی دیتا ہے ”لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أُذُنٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا“ اور دوسری چیز عقل و شعور یعنی تہقیق اگر یہ بھی مفقود ہو جائے تو حقیقت واضح نہیں ہوگی ظاہر سمجھ سکتا ہے لیکن باطن نہیں لہذا تہقیق بھی ساتھ لے کر چلیں لیکن منزل پر خطر ہے لہذا تہقیق بھی اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ میں سے اعلیٰ لے کر چلیں ان شاء اللہ منزل دور نہیں۔

تاویل کا راستہ یا اعتراض کا انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے

جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ یہ ایک کج طبیعت کا دستور ہے کہ آدمی اپنے مخالف کی بات کو چاہے وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو اسے ٹھکرا دیتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اسلام کی بھی تعلیم یہی ہے؟ ظاہر ہے اسلام تو ہر درست اور حق بات کو کسی بھی جگہ سے لینے کی تعلیم دیتا ہے ”الْكَلِمَةُ الْحَكِيمَةُ ضَالَّةٌ الْحَكِيمُ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا“ (مشکوٰۃ ۳۴ عن ترمذی) کیوں کہ خود مذہب اسلام حق ہے اور حق پر قائم ہے اسی لیے ہم تو کہتے ہیں کہ اسلام اخلاق سے نہیں حق کی وجہ سے پھیلا ہے، یعنی وہ جتنا اخلاق سے پھیلا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ دنیا میں اس لیے پھیلا ہے کہ وہ سراپا حق ہی حق ہے!! لہذا آپ اسلامی اس نظریہ کو سامنے رکھ کر اور ہمارے مباحث

پڑھ کر فیصلہ کیجیے کہ کسی مسلمان پر اعتراضات کا راستہ بہتر ہے کہ اقوال کی تاویلات کا۔ ہم ذیل میں دو مثالیں ایک قرآن شریف سے اور ایک حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں۔

اختصار کے ساتھ ہم یہ سمجھانا چاہیں گے کہ ایک قانون اور حکمت و بصیرت کے درمیان کتنا فرق ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس دو شخصوں کا جو مقدمہ آیا اس میں آپ نے اپنی سمجھ سے ایک ایسا درست فیصلہ فرمایا جو ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی سمجھ سے ایک دوسری بات کہی جو قانون کی بات تو نہیں تھی لیکن وہ ایسی عمدہ تجویز و تدبیر تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے بھی بڑھ کر تھی یہی بات قرآن نے کہی ہے ”فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ“ (سورہ انبیاء ۷۹)۔

بہتری کی وجہ یہ تھی کہ یہ فریقین کے درمیان رضا مندی سے صلح کی صورت تھی۔ بس ہم یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرز عمل کی دعوت دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ کیا اعتراضات کا راستہ بہتر ہے جس سے دین برباد ہو یا تاویلات کا راستہ بہتر ہے جس سے دین محفوظ ہو، یہ انتخاب آپ کو اپنے لیے کرنا ہے۔ خصوصاً کسی مسلمان کے غلط قول و فعل کی تاویل کی تعلیم و ترغیب اسلام نے دی ہے، جس کی دلیل ذیل کی پیش کردہ حدیث شریف ہے۔ یہ حدیث شریف چوں کہ اپنے مصدر سمیت حیاۃ الصحابہ میں ہے اس لیے ہم اس طویل حدیث کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں قارئین حوالہ سے مراجعت فرمائیں۔

واقعہ یہ بنا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت مالک بن نویرہ رضی اللہ عنہ کو ”مرتد“ سمجھ کر قتل کروادیا باوجودیکہ انہوں نے مرتد ہونے کا انکار بھی کیا تھا، پھر ان کی بیوی سے شادی بھی کر لی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے زنا کیا ہے اس لیے انہیں رجم کر دیں، حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس لیے رجم نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس میں ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہوں نے ناحق قتل بھی کیا ہے اس لیے آپ بدلہ میں انہیں قتل کر دیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں انہیں قتل بھی نہیں کروں گا، کیوں کہ ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہیں معزول ہی کر دیں تو حضرت ابوبکر نے فرمایا جو تلوار اللہ نے کافروں پر سونپی ہے میں اسے کبھی بھی نیام میں نہیں کر سکتا (حیاۃ الصحابہ مترجم ۲/۵۴۷ از کنز العمال ج ۳ ص ۱۳۲)۔ دیکھیے رجم و قتل اور معزول تینوں امور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تاویل فرمائی۔ یہ اس قرآن شریف اور حدیث شریف کی دو مثالیں ہیں جنہیں ہم اور آپ مانتے ہیں، اب آپ فیصلہ لیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

چوں کہ اس مسئلہ کا تعلق عوام سے بھی ہے اس لیے ہم دو باتیں سمجھانے کے لئے ذیل میں شریعت یا فقہ کی بیان کردہ احکام مکلف کی قسمیں اور اس کا ایک منظر (نقشہ) پیش کرتے ہیں جو کتابوں میں ہے تاکہ عوام کو بھی اپنے دین و شریعت کی حفاظت کا احساس حاصل ہو۔

دین و شریعت کا ایک مختصر خاکہ

شریعت نام ہے پانچ چیزوں کی حفاظت کا۔

دین کی حفاظت جان کی حفاظت مال کی حفاظت عزت کی حفاظت ملک کی حفاظت پھر دین نام ہے پانچ چیزوں کے مجموعے کا۔ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق۔ مکلف شخص پر عائد ہونے والے احکام کی اولاً چار قسمیں ہیں۔

(۱) خالص اللہ تعالیٰ کے حقوق: مثلاً نماز، روزہ، حج، زکات (کلمہ توحید)۔

(۲) خالص بندوں کے حقوق: مثلاً دوسرے کے مال کی حرمت۔

(۳) دونوں حقوق ہوں لیکن حق اللہ کی جہت غالب ہو۔ مثلاً حد قذف۔

(۴) دونوں حقوق ہوں لیکن حق العباد کی جہت غالب ہو۔ مثلاً قصاص۔

پھر پہلی قسم کی یعنی حقوق اللہ خالصہ کی ۸ اقسام ہیں۔

(۱) خالص عبادات : جیسے ایمان، نماز، روزہ، حج و زکات۔

(۲) عقوبات کاملہ: جیسے زنا، شراب، چوری، تہمت کی حدود۔

(۳) عقوبات قاصرہ: جزائیں جیسے قاتل مورث کو میراث سے محرومی۔

(۴) عبادت و عقوبت: جیسے تمام قسم کے کفارات۔

(۵) عبادت لیکن مع مؤنت: جیسے صدقہ فطر۔

(۶) مؤنت مع قربت: جیسے عشر۔

(۷) مؤنت مع عقوبت: جیسے خراج۔

(۸) حق قائم بذاتہ: جیسے مال غنیمت میں اور تمام معدنیات میں خمس۔

دوسری قسم یعنی خالص حقوق العباد تو وہ بے شمار ہیں۔ مثلاً

(۱) ضمان دیت (۲) تلف کردہ چیز کا ضمان

(۳) غصب کردہ چیز کا ضمان (۴) ملک بیع

(۵) ملک شمن (۶) ملک نکاح

(۷) ملک طلاق وغیرہ (حسامی ۱۲۱)

یہ احکام جس طرح فقہ کے کہے جاتے ہیں اس طرح انہیں عدالتی قوانین بھی کہے جاسکتے ہیں۔ مختلف جرائم کے ارتکاب پر ان کا اجراء کیا جاتا ہے۔

نوٹ: یہ احکامات باوجودیکہ مقاصد شریعت ہیں لیکن یہی مقاصد نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی بڑا

مقصد جب یہ احکام شرع خود لوگوں کی خواہشات میں ڈھل جائیں تو ان خواہشات اور دوائی

خواہشات سے نکال کر ان نصوص کے امتثال پر کھڑا کرنا ہے جن نصوص سے احکامات مستنبط ہیں

جیسے کہ قرآن حکیم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ”وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ

السُّلُوتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا“ (سورۃ مؤمنون ۷۱)۔ (اصول الفقہ شیخ تفتی عثمانی عن امام شاطبی ۷۲۴)

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ شریعت پانچ چیزوں کی حفاظت کا نام ہے جس میں دین کی

حفاظت بھی ہے۔ اور دین پانچ امور کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی دین کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”تعلیم الدین“

میں، دین کے پانچ اجزاء اس طرح بیان فرمائے ہیں۔ (۱) عقائد و تصدیقات۔ (۲) اعمال

و عبادات۔ (۳) معاملات و سیاسات۔ (۴) آداب و معاشرت۔ (۵) سلوک و مقامات

(اخلاق)۔ (تعلیم الدین ص ۵)۔ ان میں سے پہلے دو نمبر کی چیزیں سب ہی جانتے ہیں جسے بتانے

کی ضرورت نہیں۔ رہے معاملات تو ان کا بیان بھی اوپر ”حقوق العباد خالصہ“ کے تحت سات نمبر

تک میں ہو چکا ہے وہ معاملات کے قبیل سے ہیں اور مزید حکومت اور ملکی انتظام بھی شامل

ہیں۔ (۳۲)۔

اور معاشرت کی تفصیل یہ کہ: کھانے پینے کے، لباس کے، سونے اٹھنے کے، مجلس کے

، سلام کے، اجازت طلب کرنے کے، بات چیت کے، والدین و اساتذہ کے، ہنسی دل لگی کے،

مبارک باد کے، تعزیت کے، چھینک اور جمائی وغیرہ کے آداب ہیں (۵۰) (اولاد کی تربیت میں

اسلامی کردار قسم اول ۱۸۵)۔ ولایت و سلوک کی تفصیل یہ ہے کہ: ولایت کا مادر دو چیزوں پر ہے

۔ ایمان و تقویٰ۔ پھر ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمان کامل۔ ایمان غیر کامل۔ اسی طرح تقویٰ

کے بھی یہی دو درجے ہیں۔ لہذا ولایت کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک ولایت عامۃ، جو ہر

مسلمان کو حاصل ہے دوسری ولایت خاصہ۔ جو مخصوص اشخاص کو حاصل ہوتی ہے۔ خاصہ کے لیے ایمان کامل اور تقویٰ کامل ضروری ہیں دیکھیے (نہج الائمہ فی اصلاح الامہ ۸۸/۳) پھر اس میں ریاضت کے مختلف اسباب مذکور ہیں (تعلیم الدین ۶۷)

ذکر کردہ ایمان، نماز، روزہ، حج، زکات آپس کے معاملات و معاشرت اور اخلاق کی حفاظت کو نسا شعبہ کرتا ہے غور کیجیے۔ کیا مدارس کرتے ہیں، خانقاہیں کرتی ہیں یا دعوت و تبلیغ؟ اگر کوئی شعبہ کرتا ہے تو کتنی کرتا ہے یہ بھی غور کر لیں۔ اور عوام اور افراد اپنے اپنے طور پر بھی غور کر لیں کہ ان مذکورہ تمام امور پر عمل وغیرہ کے ذریعہ تحفظ دین میں میری کتنی جدوجہد ہے۔ غور کرنے سے بالکل واضح ہو جائے گا کہ تحفظ دین میں ہمارا حصہ عشر عشر جتنا بھی نہیں۔ یہ احساس دلانا پہلا مقصد تھا۔ تاکہ ہم اپنے متاع عزیز (دین) کو بربادی سے بچا سکیں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے دیکھ ہی لیا کہ اس کو دین بھی کہتے ہیں اور اسے شریعت بھی کہتے ہیں۔ ہمیں بتائیے کہ اس میں قرآن شریف کا اور سنت رسول (احادیث مبارکہ) کا ذکر کہا ہے؟ بالکل سیدھی بات ہے کہ ان کا ذکر کہیں بھی نہیں باوجودیکہ وہ تو تمام اصول کے لیے اصول ہیں تو یہ کتنے بڑے تعجب کی بات یا کہیں کتنے بڑے اعتراض کی بات ہے کہ ہم جس کو دین اور جس کو شریعت کہتے ہیں اس میں ہی قرآن شریف اور حدیث شریف کا ذکر نہیں۔ بس یہ سمجھنا تھا کہ جس طرح دین و شریعت میں قرآن و سنت کو نظر انداز کیا گیا ہے باوجودیکہ وہ ان کے مصادر ہیں اس طرح اگر مخصوص حالات میں کوئی کسی کو نظر انداز کرے وہ قابل گرفت اور قابل اعتراض شئی نہیں ہوتی۔ اگر اس کو سمجھ لیا ہوگا تو ان شاء اللہ آپ کو ہماری باتیں جلد سمجھ میں آجائیں گی۔

اگر کہا جائے کہ دین کی حفاظت مدارس کرتے ہیں اس لیے کہ دین کا علم وہاں پڑھایا جاتا ہے اور اگر کہا جائے کہ خانقاہیں کرتی ہیں اس لیے کہ وہاں تزکیہ کیا جاتا ہے اور اگر کہا جائے کہ دعوت و تبلیغ کا کام کرتا ہے اس لیے کہ وہ امت کو دین و ایمان پر کھڑا کرتا ہے تو سب ہی شعبہ

بلا ترجیح دین کے محافظ و معین ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی ہر شعبہ اپنی ترجیح پیش کرنے کا مجاز ہوگا۔

لیکن راقم باوجودیکہ تینوں شعبوں سے منسلک ہے اور نظر انصاف کا وعدہ کر کے آیا ہے کہتا ہے اگر گہرائی سے موازنہ کیا جائے تو بچند وجوہ دعوت و تبلیغ کی جدوجہد اپنی اخوات سے رائج ہوگی۔ پہلی وجہ یہ کہ علماء کا مقام بلند ہے وہ بلند مسند پر بیٹھ کر کام کر رہے ہیں اس طرح مشائخ تصوف بھی بلند مرتبہ پر بیٹھ کر کام کر رہے اس سے نیچے اتنا بڑا غلاء ہے کہ وہ کسی سے پر نہیں ہوتا اس کو پر کرنے کے لیے نیچے آنے کی ضرورت ہے جو ان سے ممکن نہیں چنانچہ دعوت و تبلیغ نے نیچے رہ کر اس خلا کو پر کیا۔ جس کو عمومیت و شمولیت کہیں یعنی یہ کام امت اور افراد امت کے لحاظ سے عام ہے یہ ایک وجہ ہے۔ دوسری وجہ یہی عمومیت اور شمولیت لیکن افراد امت کی نہیں جو پہلے میں تھی بلکہ دینی عمومیت یعنی دین کے اکثر اجزاء میں کام کا اثر دکھانا، ایسا اثر جس سے دین و ایمان کی حقیقت پیدا ہو جائے، جس کے نتائج تمام دنیا نے دیکھ بھی لیے یعنی یہ کام دین کے لحاظ سے بھی عام ہے۔

برخلاف مدارس وغیرہ کے وہاں صرف علم پڑھایا جاتا ہے۔ تیسری وجہ اس حدیث شریف کے تقاضہ سے ثابت شدہ دعوت الی الہدایت ہے ”مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ...“ (مشکوٰۃ ۲۹۹) کیوں کہ دعوت کا اجر اس کے غیر کے مقابلہ زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے ”وَبِهَذَا يُعْلَمُ أَنَّ لَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مُضَاعَفَةِ الثَّوَابِ... وَكَذَا السَّابِقُونَ... وَكَذَا بَقِيَّةُ السَّلَفِ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْخَلَفِ وَكَذَا الْعُلَمَاءُ الْمُجْتَهِدُونَ...“ (مرقات ۲۳۳/۱)

خلاصہ یہ کہ یہ کام ایک تو تمام افراد امت پر حاوی ہے اور دوسرے یہ کہ پورے دین

پر حاوی ہے اور تیسرا یہ کہ اگر کثیر کا ذریعہ ہے جس کی وجہ سے بجا طور پر وہ قابل ترجیح ہے۔

یہی وہ وجہ ہے جسے حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ سے تا ہنوز بڑے بڑے وہ علمائے دیوبند جو حقیقت سناش تھے یا ہیں اس کے قائل رہے، نباض علماء کی فراست و تشخیص غلط ظاہر نہیں ہوتی۔ باوجودیکہ یہ کام ایک جدید سا تھا اور اس کی بعض جہتیں قابل تسلی نہیں تھیں مثلاً آیات جہاد و قتال۔۔۔ لیکن فی الجملہ اس کی صداقت و حقانیت کا دل و جان سے اعتراف کیا، جب کہ ابھی تو کام کی کمزور شکلیں نظر آرہی تھیں لیکن بعد میں تو کام اپنی پوری توانائی کے ساتھ اٹھا کہ پھر تو خدا نے نتائج ایسے دکھائیں گویا، گویا ”إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ.. يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا“ کا منظر سچ گیا۔ اب تو عینی مشاہدہ اور تجربہ بھی کام کا مؤید بن گیا اور یہ دونوں یعنی حیات و تجربات، بدیہیات میں سے ہیں اب تو اس کا انکار بجاہت کے انکار کے مرادف ہے۔ خلاصہ یہ کہ احیاء دین کی تاثیر میں اور عام امت کے حق میں مفید ہونے میں دعوت کا شعبہ بقیہ سے رائج ہے۔

لوگوں کا رد عمل

دعوت و تبلیغ کے میدان میں پیش آمدہ مسئلہ کے نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مختصر یہ کہ ہر کسی کے دینی احوال متاثر ضرور ہوئے جس کی عادت جھوٹ بولنے کی، چغلی کرنے کی، کینہ کی، تجسس کی، نفرت و عداوت کی، غیبت کی، تہمت و غیرہ وغیرہ کی نہیں تھی وہ عادت اس المیہ کے پیش آنے سے بن گئی۔ اور جو لوگ ایمان ایمان، اللہ اللہ، حضور حضور، دین دین اور اخلاص اخلاص زندگی بھر بولتے تھے ان کے اخلاص و دین کا امتحان ہو گیا۔ کہنے سے ڈر لگتا ہے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو بے دینی کے راستے اور کھلے گناہوں کے راستے برباد ہوں! لیکن بد قسمت ہیں وہ لوگ جو دین کے راستے برباد ہوں۔ ایسی مثال نہیں دیکھی کہ جس دین سے نجات کی آس لگائے

ہوئے تھے اسی دین سے ہلاکت و بربادی ملے لیکن اب دیکھ لی۔ ”وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ“۔

در اصل اس میں بڑا کردار میڈیائی آلات، نیٹ اور واٹساپ کا رہا، کیوں کہ لوگوں نے اپنی تمام تر خرابیوں مثلاً چغلی، تجسس، حسد، کینہ، تہمت وغیرہ کا پیرا بن اتار کر انہی کو پہنایا، اب نہ جسم پاک نہ لباس پاک، دونوں نے پیٹ بھر کر شر و فساد کے پھیلائے میں اس قدر حصہ لیا کہ ”يُصْبِحُ مَوَمِنًا وَيُمُيسِي كَافِرًا“ کی طرح کس کی بات درست اور کس کی بات نادرست سمجھنا بھی دشوار ہو گیا اور اعتماد کو اٹھا دیا حتیٰ کہ بعض بڑی شخصیات کو ان کی جانب غلط نسبتوں سے دیے بیان کی صفائی دینے کی ضرورت پیش آئی۔

اس کی وجہ سے دین اور بڑے بڑے متدین حضرات کی ناقدری ہوئی، علماء عظام و دینی شخصیات، اکابر دعوت و تبلیغ کے خلاف لوگوں کی بے جا حسارتیں، جراتیں اور زبانی و تحریری بے باکیاں ان کی تغلیط، ان پر بے دین اور بد دین ہونے کے الزامات سب منظر عام پر آ گیا، اور اتنا آیا اتنا آیا کہ ایک باشعور اور حساس مزاج شخص کو اپنی آنکھوں، زبانوں کو قصداً بند کرنا پڑا، قصداً چشم پوشی سے کام لینا پڑا۔ بنا بنا یا دین پا مال ہو گیا۔ معروفات سمندر کی سمت جا کر غرق آب ہو گئے اور منکروت سمندر اور بیابان و جنگل سے نکل نکل کر لوٹ آئے جنہیں صدیوں پہلے زمین میں دفن کر دیا گیا تھا گویا زمانہ جاہلیت لوٹ آیا۔ الامان الامان۔ معلوم ہوتا ہے وہ زمانہ عزلت آ گیا جس کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اسی لیے ہم نے مذکورہ بالا نقشہ تحریر کیا ہے تاکہ اس پر غور کے بعد لوگوں کو احساس ہو کہ وہ دین کے محافظ زیادہ ہیں یا ان مذکورہ راستوں سے دین کو ضائع کرنے والے زیادہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر اعتراض کا حال

جس عظیم تحریک کا کچھ فاصلہ پر تذکرہ گزرا ہے اس کا ایک پاسبان اور عظیم سربراہ حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ جن پر ان کے بیانات کی کچھ باتوں سے اعتراضات ہوئے ہیں؟ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اسے بھول کر اس طرف نظر ڈالیے کہ ہم اہل السنہ والجماعہ کے دین کے معروف و مشہور شعبوں کے جتنے علمبردار ہوئے ہیں چاہے وہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بانی، مہتمم اور تصوف کے مشائخ اور جمعیت علمائے ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ، وغیرہ کے صدر حتی کہ تقسیم ملک کی تحریک کے دونوں طرف کے علماء حضرات وغیرہ ان سب پر کیا کیا احوال پیش آئے۔ ان سب کو دیکھ کر ایک فیصلہ تو ہر سمجھدار مسلمان یہ کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسند پر اسی کو بٹھایا تھا، یا بیٹھایا ہے جس کی ضرورت تھی کیوں کہ ان سے وہ کام درست طور پر انجام پائیے گا جو اللہ کو منظور تھے۔

اور دوسرا فیصلہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دیوبند کی پوری تاریخ میں ایک سربراہ بھی ایسا نہیں آیا جس پر گمراہی کا الزام اور راہ راست سے ہٹنے کا داغ اس پر لگا ہو، گویا اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتے کہ اہل السنہ والجماعہ پر کوئی دھبہ لگے۔ باوجودیکہ مدارس اور جمعیت اور تقسیم ملک کے مسئلہ میں علماء عظام میں کافی حد تک حالات تشویش ناک بن چکے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ تمام مناصب کے مالک علماء حضرات مسند کے لائق ہی منتخب ہوئے اور حالات کی کشاکش کے باوجود مطلوب کام بھی انجام پایا اور الزامات سے بے داغ بھی رہے۔ اللہ ہمارے ان تمام علماء کرام کو جزائے خیر نصیب فرمائیں بلکہ ان کے صدقے ہمیں بھی بخش دے تو بس مسئلہ پیش آمدہ میں بھی اطمینان رکھنے کی ضرورت ہے ان شاء اللہ یہاں بھی وہی حال ہوگا۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے بیانات کی کل مدت اگر جوڑی

جائے تو تقریباً بیس سال بنے گی جو مستقل ایک حیرت کی چیز ہے۔ اور اس سے بڑی حیرت کی چیز یہ کہ ہم اہل مدارس کے لیے مخصوص عملہ ہوتا ہے جو مشاہرہ پر کام کرتا ہے۔ تبلیغ کے پاس کام کرنے کا کوئی عملہ نہیں، نہ کوئی ان کا وظیفہ ہے اور کام پوری دنیا میں انجام دیتا ہے، غور کی بات یہ ہے کہ اس حیرت ناک کارنامہ کی طاقت کہاں سے مل رہی ہے!! ظاہر ہے کہ یہ طاقت انہیں انہی بیانات سے حاصل ہو رہی ہے۔ لہذا اتنے طویل عرصہ کے بیانات میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے یہ ممکن ہے مولانا بھی ایک بشر ہیں لہذا مذکورہ بالا چیزوں کو اگر ملحوظ رکھا جاتا تو جوابات پیش آئی ہے وہ اس قدر بڑی نہ ہوتی۔ ہمیں چاہیے تھا اس اونچ نیچ کو ہم درست کر لیتے اور ہم ہی اسکے تانے بانے کو جوڑ لیتے۔

ورنہ اگر ہم ارادہ کر لیں کہ بس گرفت کرنا ہے، تو دنیا میں کوئی مقرر ایسا نہیں جس کی بات پر گرفت نہ کی جاسکے جب کہ عام مقررین کا حال یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے اوقات طے ہوتے ہیں، عنوانات متعین ہوتے ہیں جس سے تقریر کی تیاری پیش کی کر لی جاتی ہے اور تقریر بھی ایک گھنٹہ تقریباً، تبلیغ میں ایسا نہیں ہوتا وہاں تو ایک گھنٹہ کبھی دو تین گھنٹہ، اور وہ بھی مہینہ دو مہینہ نہیں سال دو سال نہیں پورے بیس سال، تو اس میں کچھ کوتاہی ہو جائے یہ ضرور ممکن ہے۔ درحقیقت ناراضگی کا بیج پہلے سے ڈال دیا گیا ہو تو پھر اعتراضات کی لڑی خواہ مخواہ ستر عدد تک دراز کرنے میں تعجب کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کی بات پر اعتراض اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں، وہ تو انتہائی آسان کام ہوتا ہے، کیوں کہ اعتراض یا سوال عامتہ کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتا اور نہ اس کا اعتماد حکمت و بصیرت پر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی کہہ دے کہ فلاں نے ایسا کیوں کہا، ایسا کیوں کیا؟ سوال بن گیا۔ برخلاف جواب کے کہ اس میں لمبے چوڑے دلائل مطلوب ہوتے ہیں۔ اس لیے سائل کا ہر سوال قابل توجہ نہیں ہوتا۔

دراصل حضرت مولانا محمد سعد صاحب مرور زمانہ سے دعوت و تبلیغ میں داخل شدہ

مفاسد کو بسبیل حکمت و بصیرت دور کرنا چاہتے ہیں جن مفاسد کو لوگ اس لیے سمجھ نہیں پا رہے ہیں

کہ انہیں کام سے اور کام کرنے والوں سے حسن ظن اور عقیدت ہے حالانکہ وہ مفاسد کام کے حق میں جان لیوا ہیں مثلاً: کام کو رسمیت سے اور جدوجہد چھوڑ کر عیش طلی سے انجام دینا، صرف بیانات سے کام کی چاہت رکھنا، اکرام و احترام میں مبالغہ کرنا، اصاغرواکا بر میں اور علاقیت وغیرہ میں غیر مستحسنہ تفریق برتنا اور کام کو صرف بنیت برکت کرنا وغیرہ۔

حضرت مولانا لوگوں کی سمجھ سے اوپر کی گہری باتیں بار بار کہہ کر ”وَأَنَّ مِنَ الْبَيِّنَاتِ لَسِخْرًا“ ان پر سوار اس غلط نشہ کو اتار کر انہیں ہوش میں لانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ خود ہی ان گہری اور کڑی باتوں پر عمل کر کے ان مفاسد کو دور کریں اور کام کی سطح کو بھی بلند کریں اس طرح لوگوں کو ٹوکنے بھی ضرورت نہ پڑے اور سانپ بھی بلا لالٹھی ٹوٹے مر جائے۔ یہ ہے حقیقت اگر آپ اپنی بصیرت سے سمجھنا چاہیں! لیکن ہوا یہ کہ لالٹھی ٹوٹ گئی اور سانپ نہیں مرا لیکن چونکہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی مرضیات سے کام انجام پاتے ہیں یقیناً اس میں کوئی راز و خیر مخفی ہیں۔ آئیے اب ہم بنظر انصاف وجوہ اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

وجوہ اعتراضات

وجوہ اعتراضات پر غور کرنے کے ضمن میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اصلاً لوگوں کی سمجھ سمجھ کا فرق ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے وہ اقوال ایک بڑی جماعت کو سمجھ میں نہیں آئے جن پر اعتراضات وارد کیے گئے تو سوال یہ ہے کہ پھر دوسری بڑی جماعت کو کیوں سمجھ آئے اور انہوں نے کیوں اعتراضات نہیں اٹھائے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر تشویش گمراہی کے الزام کے باوجود انہیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا؟ باوجودیکہ دونوں جماعتوں میں عوام کے ساتھ علماء بھی ہیں۔ معلوم ہوا کچھ تو بات ہے اسی لیے ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ کوئی بھی قصداً قصور وار نہیں ہے۔ صرف سمجھ کا فرق ہے لہذا پہلے وجوہ

اعتراضات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

بائیں وجہ پہلا مسئلہ ان جملوں کے معنی سمجھنے کا ہے کہ ان کا معنی ان کی مراد کیا ہے؟ تو اس میں دو جماعتیں بنتی ہیں۔ ایک جماعت یہ خیال کرتی ہے کہ وہ جملے مع اپنے معانی درست ہیں۔ اور دوسری جماعت یہ خیال کرتی ہے کہ وہ جملے مع ان کی معانی درست نہیں بلکہ قابل اعتراض ہیں۔ یہاں پہنچ کر ہم قطعی طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ پھر فرق لوگوں کی سمجھ کا ہے جس سے دو جماعتیں بنتی ہیں۔ کیوں کہ ایک جس کو درست کہتی ہے دوسری اسی کو نادرست کہتی ہے تو بات بالکل واضح ہے کہ سمجھ کا فرق ہے۔ اور درست کہنے والی جماعت کا مسئلہ خارج از بحث ہے۔ کیوں کہ انہیں تو مولانا کی باتیں درست سمجھ آ رہی ہے چاہے کسی عالم کی طرف رجوع کرنے سے ہو یا از خود مولانا کے بیانات کے سیاق و سباق میں تطبیق دینے سے ہو یا حضرت مولانا پر اعتماد کر لینے سے ہو۔

البتہ نادرست سمجھنے والی جماعت کا مسئلہ قابل بحث ہے کہ ان کی سمجھ کیوں نادرست کہتی ہے۔ تو یاد رکھیے نادرست کہنے کی بھی کئی وجوہات اور کئی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً الف: حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے عدم اعتماد بالفاظ دیگر ذاتی دلی خرابی کی وجہ سے ہو کہ وہ صحیح سمجھنے کو قصداً نظر انداز کریں، یعنی سمجھنا ہی نہ چاہیں نہ از خود نہ ان علماء حضرات سے جو انہیں سمجھا کر مطمئن کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا یہ عدم اعتماد یا دل کی کھوٹ صرف ان کی ذات تک محدود ہو۔

ب: یہ بھی عدم اعتماد دالے ہیں لیکن ان کی دلی خرابی صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہو بلکہ اشتعال پسندی بھی شامل ہو جس کی وجہ سے وہ مولانا کی بات کو غلط معنی پہنا کر دوسری ایسی تعبیر میں پیش کریں جس سے اعتراض اٹھے ان کی طبیعت میں دوسروں کو بھڑکانا شامل ہو۔ یہ اول قسم سے زیادہ سنگین ہے، کیوں کہ اول میں شر ہے لیکن دعوت الی الاثم نہیں۔ اور اس میں شر ہونے

کے ساتھ دعوت الی الاثم بھی ہے۔

نوٹ: یہ بات فراموش نہ کی جانی چاہئے کہ کسی قدر بڑے آدمی کی زندگی میں بہت سے مواقع اس کے محسبین و متعلقین کی جانب سے عقیدت میں دعوت الی الاثم اور تعاون علی الاثم کے سامنے آتے ہیں جس کا تجربہ ہر باشعور بڑے آدمی کو ضرور ہوگا۔ اب بوجہ خوف خدا و تيقظ و حکمت اس سے بچاؤ کر لیا جاتا ہے اگر ان میں خوف خدا غالب ہو یا پھر غلبہ محبت و عقیدت اور قلت تيقظ و خوف کی وجہ سے اس پر اقدام کر لیا جاتا ہے جس سے ایسی جگہ سے شر و فساد برپا ہوتا ہے جس کا واہمہ بھی لوگوں کو اس کے علوم رتبہ کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہاں ایسا ہوا ہو خلاصہ یہ کہ بڑا رتبہ ایک سخت آزمائش کی چیز ہے لہذا اس سے بچنے کا بھی اہتمام ہوا اور سمجھنے کا بھی اہتمام ہو کہ ہم اسے سمجھیں۔

ج: تیسری قسم نا سمجھی کی کمی والوں کی ہے، دل صاف ہو لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ بات درست ہے یا نادرست لیکن اپنے ہم نشینوں کے ساتھ ہو جائیں۔

کسی کے کلام کو نہ سمجھ سکنایہ ممکن ہوتا ہے اس کی ہم حدیث شریف سے مثال دیتے ہیں آپ ﷺ کا ارشاد ہے ”مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا الْمَوْتُ“ یہاں معنی متعین کرنے میں دقت ہو سکتی ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں تو موت کو دخول جنت سے مانع بنایا گیا حالانکہ سمجھ کہتی ہے وہ تو دخول جنت کا سبب ہے نہ کہ مانع تو اس کا حل کئی طرح سے نکالا گیا ہے۔

(۱) إِلَّا الْمَوْتُ بِمَعْنَى إِلَّا عَدَمَ الْمَوْتِ (بتقدیر مضاف)۔ (۲) قَالَ الطَّبِيبِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ الْمَوْتُ حَاجِزٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ دُخُولِ الْجَنَّةِ۔۔ یعنی موت آدمی اور دخول جنت کے درمیان مانع ہے لیکن اس کا تحقق ہو جائے تو پھر دخول جنت سے مانع نہیں۔ (۳) ”قَالَ عَلِيٌّ

القَارِي۔۔ الا أَنْ يَمُوتَ كَافِرًا“ بتقدیر حال اور یہ تاکید المذبح بمایشبہ الذم کے قبیل سے ہے جیسے کہ آیت قرآنیہ میں ”وَمَا تَقْصُمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ۔۔ (مرقات ۲/۳۶۸)۔ معلوم ہوا کہ کسی کی بات میں سمجھنے اور نہ سمجھ سکے کا احتمال رہتا ہے۔

اس قسم کی بھی دو قسم ہو سکتی ہے فقذیر: اس قسم کا مسئلہ بھی خارج از بحث ہے۔ سنگین مسئلہ دوسری قسم کا ہے کہ شاید انہوں نے اولاً حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے خلاف ہوا چلائی اور بڑی مضبوط تدبیر سے اپنے ارادہ کی کامیابی حاصل کی وہ تدبیر یہ کہ از خود آواز اٹھاتے تو وہ ماری جاتی لہذا انہوں نے اسے دارالعلوم اور دارالافتاء تک پہنچا دیا اور سارے الزامات سے اپنے کو بچا دیا اور مسئلہ کا بیڑا دارالافتاء نے اٹھالیا، پھر مسئلہ اس طرح زور پکڑ گیا کہ امت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

نوٹ: ہم اپنی نظر انصاف اور مؤمنین سے حسن ظن کو قائم رکھتے ہوئے یہ بھی ضرور کہیں گے کہ دوسری اور تیسری قسم پر ہم نے شر کا اور شر پسندی کا الزام لگایا ہم خدا سے اور ان حضرات سے بھی معافی چاہتے ہیں کہ اگر واقع میں وہ ایسے نہ ہوں تو ہم غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے جو کام کیا وہ صالح نیت اور صالح ارادہ سے کیا ہو لیکن نتیجہ سامنے آنے کے بعد اتنی بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ اقدام امت و دین کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ اور ہم نے جو کہا وہ ایک احتمال کی فہرست میں یقینی طور پر آنے کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تعیین معنی میں خطا کی وجوہات

یہ بات ذہن نشین ہو کہ ہر انسان سے خطا و نسیان کا صادر ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کا وقوع گاہے گاہے ہوتا ہے جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ پھر چاہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب ہوں اپنے اقوال میں یا دونوں طرف کے علماء حضرات ہوں اقوال کے معنی متعین کرنے میں یا دار

العلوم دیوبند کے علماء حضرات ہوں اپنے فتویٰ میں یا راقم الحروف ہو اپنی باتوں میں یا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے علاوہ اکابر دعوت و تبلیغ ہوں اپنے طرز عمل میں۔ زیر بحث مسئلہ خطا و نسیان کا نہیں ہے۔ مسئلہ ہے اس کا کہ کون سے کام میں کتنا ارادہ اور کیسا ارادہ شامل ہے؟ کیوں کہ پورا مسئلہ انہی پر متفرع ہے۔ اور صرف قصد ہی نہیں، قصد کے ساتھ مسئلہ ہے تیقظ و بیداری اور احتیاط سے کام لینے کا کہ کس نے کتنے تیقظ سے اور کتنے احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ نتیجہ کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ارادہ کی خرابی یا احتیاط و تیقظ کی کمی زیادتی نے مسئلہ کو متاثر کیا ہے۔ یہاں بھی کئی احتمالات بنتے ہیں۔

الف: قصد اخطاء کا ارتکاب کرے یعنی حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی غلط تعبیر کرے اور غلط معنی پہنائے۔ ہمارے دین و اسلام کا تقاضہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم یہ الزام اپنے کسی مسلمان بھائی پر عائد کریں۔ لیکن احتمال کا تقاضہ اور دور احتیاط کا تقاضہ اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس مسئلہ کے نقصان کے پیش نظر یہی احتمال غالب نظر آ رہا ہے۔ اگر فی الواقع یہی ہوا ہے تو اس قسم کے لوگ اپنے سوء ارادہ کی وجہ سے ”شاید“ حق کے دلائل کے بعد بھی اسے تسلیم نہیں کریں گے اگر اللہ توفیق دے تو الگ بات ہے، بس انہیں خدا سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔

ب: قصد اخطاء کا ارتکاب نہ کیا ہو لیکن پھر بھی خطا کو درست سمجھ لیا ہو۔ تو یہ لوگ معذور ہیں لیکن جب تک دلائل سے حق واضح نہ ہو جائے۔ اگر اس کے بعد بھی حق کو نظر انداز کریں تو پھر معذور نہیں۔

ج: حضرت مولانا کے اقوال کے تعین معنی میں خطا کا واقع ہونا، عدم تیقظ، غلو فی الاحتیاط اور دعوت و تبلیغ کی حقیقت (واقعہ) سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور اپنی ذہنی

تخفظات و جمود پر اعتماد کی وجہ سے ہوں علوم قرآن و حدیث کی وسعتوں اور بلندیوں کو فراموش کر کے جن کی بلندی اور وسعت آسمانوں کے برابر ہیں جس کی وجہ سے ظاہری الفاظ سے جو ظاہری معنی مفہوم ہوئے وہی مراد سمجھ کر باعث اعتراض اور خلاف شرع تصور کیا ہو یہ اگر عوام کی جانب سے یا عام علماء حضرات کی جانب سے ہو تو کم خطرے کی چیز ہے لیکن بڑی مسندوں کے حامل علماء حضرات کی جانب سے ہو (جیسا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں ہوا ہے) تو بڑے خطرے کی چیز ہوگی کیوں کہ یہ ”مطلق“ خطا میں شامل نہیں۔ قندبر۔

تعین معنی میں سب سے مقدم اور بہتر طریقہ

جب قائل کی کوئی بات (یا فاعل کا فعل) بظاہر شریعت سے منحرف نظر آئے تو اس کی مراد اور معنی کی تعین میں کئی طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان تمام طریقوں میں مقدم اور بہتر طریقہ خود قائل و فاعل کی طرف مراجعت کا ہے کہ خود اسی سے مراد پوچھی جائے جس میں دوسرے معانی متحمل کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور مراد کلام صاف بے غبار ہو کر واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے صحیح معنی کا تعین ہوگا۔ یہ طریقہ نہ صرف عقلی طور پر مقدم اور بہتر ہے بلکہ شرعی طور پر ثابت اور مطلوب ہے۔

ہم اس کی مثال بلاغت کے ایک واقعہ سے اشارۃً پیش کرتے ہیں حجاج بن یوسف اور قبعشری کا واقعہ: قبعشری نے کہا تھا: ”اللَّهُمَّ سَوِّدْ وَجْهَهُ وَاقْطَعْ عُنُقَهُ وَاسْقِنِي مِنْ دَمِهِ“ اے اللہ اس کے چہرے کو سیاہ کر دے اور اس کی گردن کاٹ دے اور اس کا خون مجھے پلا دے۔ جب اس کی خبر خلیفہ حجاج کو پہنچی تو قبعشری کو بلا کر پوچھا کیا تو نے یہ کہا ہے؟ تو اس نے کہا ہاں لیکن آپ کے بارے میں نہیں انگور کے بارے میں کہا ہے تو حجاج نے کہا ”لَا تَحْمِلَنَّكَ عَلَى الْإِدْهَمِ۔“

مختصر المعانی میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ مخاطب سے صادر کلام کو اس کی مراد کے خلاف پر محمول کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی شخص اپنی مراد پر کلام کو ڈھال کر کسی کو مجرم بھی ٹھہرا سکتا ہے پھر اسے سزا دے سکتا ہے تو دوسرا شخص یعنی مجرم اپنی مراد پر کلام کو ڈھال کر قید و قتل سے نجات بھی پاسکتا ہے (مختصر المعانی ۱۲۶)۔ واقعہ سے معلوم ہوا کہ معنی و مراد کے بدلنے سے آدمی سزا سے بچ سکتا ہے۔ تو غور کی بات یہ ہے جب کوئی سزا سے بچ سکتا ہے تو کسی کی مراد کو درست بتا کر گمراہی سے کیوں نہیں بچایا جاسکتا۔ اگر متکلم کے علاوہ قول کی مراد متعین کرے تو اس میں خطا کا احتمال ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ جس کو بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ

الف: اگر کوئی کسی کا قول تاویل کرانے کے لیے لائے تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر جانتا ہو اور بنظر انصاف تاویل کر سکتا ہو تو کرے ورنہ خاموش رہ کر دوسرے کے حوالے کر دے۔ اب جس کے حوالے ہو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

ب: ایک یہ کہ بنظر انصاف تاویل کرے۔

ج: دوسری یہ کہ بنظر انصاف نہ کرے بلکہ غرض فاسد کی وجہ سے خیانت کرے اور غلط تاویل کرے۔ اگر غلط تاویل خیانت سے کرے تو اس کا نقصان تو ظاہر ہے۔

د: بنظر انصاف تاویل کرے لیکن پھر بھی بعض حالات میں نقصان ہوتا ہے کیوں کہ تاویل کرنے والا اگرچہ بنظر انصاف یعنی صالح ارادہ سے کر رہا ہے ”إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ“ لیکن معاملہ کی سنگینی کو وہ نہیں جانتا جس کی وجہ سے صالح ارادہ کے باوجود وہ انجام کہ اعتبار سے شر بن جاتا ہے جس کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر ”وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ“ سمجھایا ہے۔ لہذا دوسرے کی تاویل میں شر کا پہلو غالب ہے۔ شاید پیش آمدہ مسئلہ میں

یہی صورتیں پیش آئی ہیں۔ (واللہ اعلم)

ما سبق کے تین عنوانات کا حاصل :

اگر کوئی شخص پیش آمدہ مسئلہ میں خرابی کا سراغ لگانا چاہے تو ہم نے ان تین عنوانات میں اشارہ کر دیا ہے، اسے چاہیے کہ صورت حال کا تجزیہ تین عنوانات میں اس طرح کرے کہ وجوہ اعتراضات کے تحت تین احتمالات تھے، دل کی خرابی، دل کی خرابی مع شریعت پرستی۔ نا سمجھ لوگ لیکن وہ بھی ان کے ساتھ۔۔۔ تعیین معنی میں خطا کے تحت تین احتمالات تھے، قصد خطا کرنے والے۔ خطا کو درست سمجھنے والے، عدم تيقظ کی وجہ سے صحیح مراد نہ پانے والے۔۔۔ مقدم اور بہتر طریقہ کے تحت چار احتمالات تھے، جس میں سے ایک بنظر انصاف تاویل نہ کرے، دوسرا بنظر انصاف کرے لیکن نا سمجھی کا شکار ہو جائے۔ یہ ساری وہ صورتیں ہیں جن سے معاملہ فساد و فتنہ کی شکل اختیار کر جائے بلکہ کر گیا، ہمیں سے معاملہ کا سراغ ہاتھ لگتا ہے کہ معاملہ میں کہاں کیا ہوا ہے اس میں کس کی جانب سے کتنے ارادہ بد اور خیانت کا دخل ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہم نے شروع ہی میں لکھا ہے کہ یہ سب امور باطنہ ہیں نہ کسی کا تزکیہ درست ہے نہ کسی پر الزام درست ہے۔ (واللہ اعلم)

قابل اعتراض رجال دین کے چند اقوال

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی وہ صحیح تاویل نہیں ہو سکتی جس کے آپ متمنی ہیں بلکہ وہی موقف صحیح ہے جو دارالعلوم دیوبند نے اختیار کیا ہے، تو پھر ہم یہ بھی پوچھیں گے کہ حضرت مولانا کے اقوال کی تاویل نہ ہو سکنے کی وجہ کیا ہے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ وہ اقوال خلاف شرع ہیں، اور بھلا خلاف شرع کی تاویل کیسے ممکن ہے!!؟ تو اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ پھر آپ ذیل میں ہمارے ذکر کردہ رجال دین کے اقوال میں بھی ہتھیار

ڈال دیں گے کیوں کہ وہ بھی ایسے ہی خلاف شرع ہیں پھر تو آپ ان رجال دین پر بھی وہی حکم ”اندیشہ ضلالت“ لگائیں گے۔ نعوذ باللہ منہ۔ جو حضرت مولانا محمد سعد پر لگایا ہے؟ ظاہر بات ہے وہ حکم نہیں لگا سکتے۔

دوسرا احتمال : یہ ہے کہ ذیل کے اقوال مشائخ میں تو تاویل کریں گے۔ کیوں کہ وہ حکم ممکن ہی نہیں۔ تو ہم پوچھیں گے کہ تفریق کی وجہ کیا ہے؟ دیگر کے اقوال میں تاویل اور مولانا کے قول میں ترک تاویل۔ یہ کیسی نا انصافی ہے پھر تو خیانت و نا انصافی کی وجہ سے عند اللہ ماخوذ ہونا موافق شرع ہے۔ چون کہ ہمیں اپنے علماء حق کے بارے میں اس کا پورہ یقین ہے کہ وہ مذکورہ خیانت و تفریق اختیار نہیں کر سکتے تو ثابت ہو گیا کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال تاویل کے قابل ہیں اور جب تاویل ممکن ہے تو ان پر نہ اعتراضات درست ہیں نہ وہ حکم جو ان پر لگایا گیا ہے۔ اقوال کے ذکر سے پہلے دو باتیں۔

نوٹ : ہم حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تاویل کے درپے اس لیے نہیں کہ ہمیں ان سے عقیدت ہے جیسا کہ ہم نے شروع میں اور خاتمہ میں کہا ہے ان کے اکثر اقوال کی تاویلات تو ہمارے ذہن میں دس سالوں سے گردش کر رہی تھیں۔ تب ہی تو انشراح صدر سے اس کام پر کمر کس کے آمادہ اس وقت ہوئے ہیں۔ جب کہ پورے صوبہ گجرات میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ”حق پر“ ہونے کی بات کو جہالت سمجھا جاتا تھا بلکہ کام ختم ہونے تک تو کسی کتاب و تحریر کا علم نہیں تھا پھر بھی ”توکل علی اللہ“ کام شروع کر دیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اقوال واقع میں تاویل صحیح کے متحمل و مستحق ہیں۔ جس سے ہم چاہتے ہیں کہ کسی طرح لوگ نا سمجھی سے نکل جائیں اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ دونوں مشرب ”دارالعلوم اور مرکز نظام الدین“ ہم سفر ہو کر چلیں۔ دوسری بات ہم مشائخ تصوف کے اقوال اس لیے نہیں پیش کر رہے ہیں

کہ ہمیں تصوف سے ناراضگی ہے۔ بندہ بھی پیر رکھتا ہے لیکن دعوت کی عمومی محنت کی وجہ سے اس سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے۔

اقوال

ہم ان اقوال کو اوپر سے نیچے کی ترتیب پر بیان کرتے ہیں۔ پہلے صحابہؓ کے، پھر مشائخ تصوف کے پھر دور حاضر کے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”قَامَ أَبُوبَكْرٍ فِي الرِّدَّةِ مَقَامَ الْأَنْبِيَاءِ“ کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ مرتدین کے قتال میں مقام انبیاء پر قائم ہیں۔ ہم واقعہ بیان کر کے طول دینا نہیں چاہتے۔ وصال نبوت کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے تنہا جو کارنامہ انجام دیا جس میں تمام صحابہ متفق بہ انکار تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ باصرار۔ اس کارنامے کے اختتام پر جب نتائج سامنے آئے تو حضرت صدیق کو داد دیتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا ”قَامَ أَبُوبَكْرٍ فِي الرِّدَّةِ مَقَامَ الْأَنْبِيَاءِ“۔

اس کا حوالہ تو ابھی بڑی کتاب کا یا دن نہیں پڑھا ہوا یاد رہ گیا ہے۔ لیکن سیرت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں ضرور ہے از امام اہل اسلمت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب۔ (سیرت خلفاء راشدین ۴۳)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول پر بڑا اعتراض ہے کہ انہوں نے ایک امتی کو مقام انبیاء پر کیسے کھڑا کر دیا؟ کیا یہ نبی کی اس کی شان میں تنقیص نہیں ہے بلکہ یہاں تو انبیاء جمع کا صیغہ ہے جو تمام نبیوں کی شان میں تنقیص کو بتاتا ہے۔ کہاں ہیں وہ حضرات جو حضرت مولانا محمد

سعد صاحب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا اعتراض کرتے ہیں۔ اسی طرح صحابی رسول حضرت طفیل دوسی رضی اللہ عنہ اور نوح علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی تنقیص کہتے ہیں۔ یہاں جواب دیں اور مسئلہ صرف فقہ کا نہیں ہے عقیدہ کا ہے اس پر کیا حکم لگ سکتا ہے؟ اگر جواب چاہتے ہیں تو حضرت ابو ہریرہؓ سے سیکھیں نہیں تو ہماری تاویل قبول کر لیں۔ اور اسی کارنامے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”كَرِهْنَا فِي الْإِبْتِدَاءِ أَحْمَدًا عَلَى الْإِنْتِهَاءِ“ کہ ہم نے اس معاملہ کو ابتداء میں تو ناپسند سمجھا تھا لیکن انتہاء میں ہم نے اچھا سمجھا۔

دیکھیے اس کو کہتے بصیرت بھی اور نظر انصاف و امانت داری بھی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سادہ ذہنیت سے اقرار کر رہے ہیں اور اپنی اول نظر کی خطا کا اقرار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ اول نظر میں وہ نادرست دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی درستی بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مثال تو یہی اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کتابیہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت۔۔۔ اور صلح حدیبیہ۔۔۔ اور ابتداء ہجرت میں کفار مکہ کی دہ کر صلح کی شرطوں کو مان لینا وغیرہ۔

بلکہ نفس مدارس بھی اس کی مثال ہے اگر تاریخ مدارس پر نظر ہو۔ بقول علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء چوتھی صدی میں ہوئی۔ چنانچہ اہل نیشاپور نے سب سے پہلے ”مدرسہ بیہقیہ“ کی بنیاد ڈالی، لیکن اس کی طرف امت نے کوئی توجہ نہ کی۔ (کتاب الخطط والامائر ۲/۳۶۲) تو دیکھیے نظام مدارس کا ابتدائی ڈھانچہ بھی عدم توجہ کا شکار رہا لیکن چوتھی صدی کے بعد بالترتیب وہ رواج کی حد میں داخل ہو گیا اور مدح و تعریف کا سہرہ اپنے سر باندھ لیا۔ ان امثال سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ ابتداء ایہی ہو رہا ہے ان شاء اللہ انتہاء اُجھی وہی ہوگا۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بلا وسوسہ والی نماز کے بارے میں ارشاد ہے ”إِنَّ الصَّلَاةَ الَّتِي لَا وَسْوَسَةَ فِيهَا إِمَامٌ صَلَّى صَلَاةُ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى“ (مرقات ۱۳۶:۱)۔ سوال یہ ہے کہ کون ایسا ہوگا جس کی نماز میں وسوسہ نہ ہو۔ تو کیا سب کی نمازیں یہود و نصاریٰ کی نمازیں بن جائیں گی؟

(۳) سید الطائفہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا: ”خُضْنَا بَحْرًا وَقَفَّ الْأَنْبِيَاءُ عَلَى سَاحِلِهِ“ (نبراس ۳۳۶) کہ ہم ”معرفت“ میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انبیاء علیہم السلام تو اس کے کنارے پر ہی ٹھہر گئے۔ مطلب انبیاء علیہم السلام سے بھی آگے بڑھ گئے کتنا بڑا اعتراض ہے! دیکھیے یہاں بھی مسئلہ عقیدہ کا ہے اور آپ معترض کے خیال میں ایک نبی نہیں تمام انبیاء علیہم السلام کی شان میں زبردست تنقیص ہے۔ لحاف اوڑھ کر بیٹھ جائیں گے یا ان اصحاب اقوال سے کچھ سیکھنا بھی سیکھیں گے۔

(۴) سید الطائفہ ہی کا ملفوظ ہے ”أَوْقَى الْأَنْبِيَاءُ اسْمَ النَّبُوءَةِ وَأَوْتَيْنَا اللَّقَبَ أُنْجَى مُجَرَّ عَلَيْنَا اسْمَ النَّبِيِّ مَعَ أَنَّ الْحَقَّ -- وَيُسَمَّى هَذَا الْمَقَامُ مِنْ أَنْبِيَاءِ الْأَوَّلِيَّاءِ (نبراس شرح عقائد ۴۴۵ حاشیہ مولوی برخوردار) دیکھیے وہ اپنے لیے انبیاء اولیاء کے لقب کے قائل ہیں اور اس کے کہ ہمیں صرف نبوت کے نام سے روکا گیا ہے کہ ہم پر نبی کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا لیکن لقب تو پھر بھی ہمیں مل ہی گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنا بڑا اعتراض ہے!! وہ مطلق رفع نبوت کے قائل نہیں۔ وہ تشریحی نبوت کے مرتفع ہونے کے قائل ہیں۔ شاید آپ گھبرار رہے ہوں گے کہ یہ کیا لکھا جا رہا ہے، لیکن آپ اگر نظر انصاف، امانت داری اور بہ طور خاص تہیقظ کو لے کر ہمارے ساتھ رہیں گے تو ان شاء اللہ منزل دور نہیں۔ بس آپ سفر میں نظر انصاف اور تہیقظ کا گوشہ ضرور ساتھ لیں۔

(۵) منصور حلاجؒ کا ملفوظ ہے ”اَنَا الْحَقُّ“ یہ تو کتنا بڑا ملفوظ ہے!!! فرعون نے کہا تھا اَنَا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی تو منصور حلاجؒ کا ملفوظ بھی اس سے کم نہیں ہے۔ نعوذ باللہ۔ یہ تو خدائی دعویٰ ہے۔ کیا جواب دیں گے؟ جب اتنے بھیا نک و سنگین اقوال کی تاویل ہوئی ہے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال تو ان کے مقابل میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اس کی تاویل میں ہتھیار ڈال دیں گے لیکن ان شاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسے اقوال سالوں پہلے کتابوں میں دیکھ چکے تھے اور اس کے درست ہونے کو خدائی عطا کردہ علمی فہم سے پہلے ہی پا چکے تھے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال سے کیسے بھڑکتے۔ ”لَوْ كَشَفَ الْغِطَاءُ مَا زِدَدْتُ يَقِينًا“

(۶) اہل تصوف کے بارے میں ہے ”يُنْكِرُ اَهْلُ التَّصَوُّفِ تَرْكَ الْاَوْرَادِ كَمَا يُنْكِرُونَ الْفَرَائِضَ“ (مرقات ۱۵۳/۳)۔ یہاں تک فرمایا ”تَارِكُ الْاَوْرَادِ مَلْعُونٌ“ (مرقات ۱۵۰/۳) اور ادونو اہل کا درجہ رکھتے ہیں اسے چھوڑنے کو اہل تصوف اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا فرائض چھوڑنے کو بلکہ چھوڑنے والے کو ملعون کہتے ہیں۔ نوافل کو فرائض کا درجہ دیا جا رہا ہے کیا یہ معمولی اعتراض ہے؟ اور ترک نوافل پر لعنت کیسے؟ حالاں کہ علماء رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ مندوب پر اصرار کرنا تو شیطان کا حصہ یعنی شیطانی عمل ہے کیا اعتراض کی چیز نہیں!!۔ (تلیق المسحیح ۴۰۹/۱ مرقات عن طبعی ۲/۳۵۳)۔ اب تک تو ہم نے دور صحابہ اور مشائخ تصوف کی مثالیں دیں لیکن ان سب سے آگے چل کر مطمئن ہو جائیے آئیے قرآن کریم کی مثال پر یہاں آپ کہیں گے بس بس بات سمجھ آگئی۔

(۷) قرآن شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرمان ہے وَادِّقَالَ اَبْرَاهِيْمُ۔۔۔ فَلَمَّا رَاَ كَوْكَبًا قَاعًا قَالًا هَذَا رَبِّي۔۔۔ قَالًا هَذَا رَبِّي هَذَا كَبَرُ۔ (پارہ ۷) حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستارے، چاند اور سورج کو رب فرمایا۔ العیاذ باللہ۔ کتنا بڑا اعتراض ہے؟ کہ امتی نہیں بلکہ نبی ایسی بات کہہ رہا ہے جو باعث کفر و شرک ہے۔ لیکن اس کا حل مفسرین نے بصورت تاویل ایک معمولی جملے سے پیش کر دیا ہے۔ مفسرین نے جس جملے سے حل پیش کیا ہے وہ چاہے ایک معمولی جملہ ہے لیکن وہ درحقیقت اصول کی ترجمانی ہے جن اصولوں کو ہم بیان کرنے والے ہیں اور کچھ کو ضمنی طور پر بیان کر کے آئے ہیں۔ وہ ہے مختصر المعانی کے حوالے سے پیش کردہ بات کہ مخاطب کے حال کو اس کی ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر کلام کرنا یا کہیے دینی مصلحت کو ملحوظ رکھنا وغیرہ۔ یہی وہ باتیں ہیں جو ہم مولانا محمد سعد صاحب کے بارے میں کہنے والے ہیں

(۸) موجودہ زمانہ کی مثال: ہمیں بتائیے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں پوری مسلم قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے کوئی مسلمان یا عالم دین اتحادی کانفرنس میں سری رام، بھگوان وغیرہ کے جملے مجبوری میں زبان سے ادا کرے اور غیروں کے کارنامے کو سراہے باوجودیکہ وہ اسلام سے ٹکراتے بھی ہوں جیسا کہ جمعیت کے پلیٹ فارم سے ہو رہا ہے۔ یا قومی تعصب کو مٹانے کے لیے اور مسلم قوم کو بڑی خرابیوں سے بچانے کے لیے پارلیمنٹ میں کوئی مسلم یا عالم اسی طرح کے اقوال و افعال اختیار کرے ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھے باوجودیکہ وہ افعال ہماری شریعت سے ٹکراتے ہوں۔

تو کیا ان سب کو دارالافتاء ایجا کر کفر کے فتویٰ کا انتظار کریں گے۔ نعوذ باللہ۔ یا دارالافتاء سے بچا کر مسلمانوں کی نمائندگی کا راستہ کھلا چھوڑیں گے، یہ کہہ کر کہ مصلحت کا تقاضہ ہے۔ ظاہری بات ہے کہ لوگ جمعیت و پارلیمنٹ کے ان کرداروں کو اپنی ملکی قومی مصلحت سمجھ کر نہ صرف

اس کو درست سمجھتے ہیں بلکہ ان علماء حضرات کو داد دیتے ہیں ان کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور ان کے اقوال و افعال کی تاویل کر لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تاویل کے بغیر کوئی چھٹکارہ نہیں۔ اگر تاویل کا دروازہ بند کر دیں گے تو تکفیر کا دروازہ کھل جائے گا۔ کیوں کہ جب کوئی قول و فعل بظاہر خلاف شرع ہو تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ خلاف شرع ہونے کا تقاضہ، دینی تقاضہ اور دینی مصلحت تو نہیں، اگر دینی مصلحت ہے تو پھر اس کی گنجائش ہوگی اور اس کی صحت کی تاویل کریں گے جیسے کہ خود اس آیت شریفہ سے مفہوم ہو رہا ہے ”إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ“۔۔۔ (پ ۱۴)

(۹) امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مَنْ شَغَلَكَ عَنِ اللَّهِ فَهُوَ صَنَمٌ“ (تذکرہ ابوالکلام آزاد ۳۲۲)۔ کون شخص ایسا ہوگا جس کا ماسوا اللہ کے ساتھ اشتغال نہ ہو۔ تو پھر وہ مشغلہ اس کا صنم ہو جائے گا۔ کتنا بڑا اعتراض ہے!! کون بچ سکتا ہے! ہر شخص پر منطبق ہو سکتا ہے اور ہر شخص اس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں ہم صرف بڑے علماء حضرات کے لیے اشارۃً لکھتے ہیں مثلاً: (۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا سورہ فاتحہ و معوذتین کے بارے میں نظریہ (۲) شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فرعون کی توبہ کے بارے میں نظریہ (نیراس) (۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتابی عورتوں سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو نکاح کرنے سے ممانعت، (ازالہ الخفاء مترجم ۴۱۰) باوجودیکہ اس کی حلت کتاب اللہ سے ہے، (۴) اسود عسی مدعی نبوت کذاب نے ”عبداللہ بن ثوب رحمہ اللہ تعالیٰ“ کو نبی نہ ماننے پر آگ میں ڈالا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا ”حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شبیہ اس امت میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ (سیرت خلفاء راشدین ۱۱۰) (۵) حضرت سفیان ثوری

رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس نے نماز میں خشوع اختیار نہیں کیا اس کی نماز فاسد ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کوئی بھی نماز جس میں حضور قلب حاصل نہ ہو اس کی نماز سزا دینے کے زیادہ لائق ہے۔ (تعلیق الصبح ۲۶۱) پوچھیے دارالافتاء کے علماء حضرات سے کہ فقہ میں کتنا خشوع فرض ہے؟ فقہ میں صرف بوقت تکبیر تحریمہ خشوع فرض ہے، پھر حضرت سفیان و حسن پر کیا فتویٰ لگائیں گے۔ جب علم باطن کے یہاں پوری نماز میں ضروری ہے ان علم باطن والوں سے کیسے نمٹیں گے۔ حضرت علیؑ کا قول اس سے بھی زیادہ سنگین گزرا ہے وہ بھی ملحوظ رہے۔ (۶) شیخ ابو سعید خرازی فرماتے ہیں ”فَتَحَّ اللَّهُ عَلَيْهِ بَابُ الْقُرْبِ ثُمَّ رَفَعَهُ إِلَى فَجَائِسِ الْإِنْسِ ثُمَّ أَجْلَسَهُ عَلَى كُرْسِيِّ التَّوْحِيدِ“ (مرقات ۲۷۱) دیکھیے توحید اہل اللہ نے کیا کیا کہا ہے اور علماء حضرات نے کیا کیا لکھا ہے!! لیکن پھر بھی ضلالت کا حکم نہیں لگا۔ کیا اب آپ بنظر انصاف بتائیں گے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر وہ حکم لگ سکتا ہے کہ نہیں؟

نوٹ : ہم کسی اور سے نہیں معترض کو کہہ رہے ہیں کہ کیا ان سب میں تاویل کریں گے اگر نہیں تو پھر ان سب پر کیا حکم لگائیں گے؟ اور اگر سنگین حکم سے بچانے کے لیے تاویل کریں گے تو پھر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی کیوں نہیں؟ جب کہ دونوں اقوال کی سنگینی یکساں ہے۔ آپ خود تاویل کیجیے نہیں تو ان شاء اللہ ہم ان کی تاویل پیش کریں گے۔

طلب فتویٰ اور دارالعلوم کا فتویٰ

ہم اس کا اذعان کرتے ہیں کہ اللہ نے اگر علم کی دولت عطا کی ہو تو وہ خواہ مخواہ کسی سے لکراؤ کے لیے نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کے لیے، اس کی نشر و اشاعت کے لیے اور اظہار حق کے لئے ہے۔ سمجھیے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ضروری باتیں بتائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توجہ حاصل ہوئی تو فرمایا ”كَوَلَا عَلَىٰ لَهْلَكَ عَمْرٌ“ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عمر کے پاس علم نہیں تھا اس طرح ہماری جانب سے ضروری بات بتانے کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات علماء دیوبند دامت برکاتہم کے پاس علم نہیں۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دارالعلوم ہمارا ایسا علمی مرکز علی قلعہ ہے جیسا نظام الدین ہمارا دعوتی مرکز ہے۔ ہمیں اپنے دارالعلوم پر بجا طور پر ناز ہے۔ لیکن کچھ ضروری گزارشات بھی ہیں جنہیں ادب سے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور تعظیم و ادب میں کوئی ذرہ برابر مبالغہ نہیں دل کی کیفیت کو خدا جانتے ہیں یہ تو ”أَنزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ“ کی وجہ سے ان کا ہم پر لازمی حق ہے ایسا ہی جیسا اپنی سمجھ پیش کرنا ہمارا شرعی لازمی حق ہے۔ ”فَإِنْ أَصَبْتُ فَمِنْ اللَّهِ وَإِنْ أَخْطَأْتُ فَمِنِّْي وَمِنَ الشَّيْطَانِ“ وہ یہ کہ

زیادہ تر مسئلہ میں معترض کو جو قوت حاصل ہوئی ہے اور اکثر لوگوں کی حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے جو بدظنی پیدا ہوئی ہے وہ ہے دارالعلوم کا فتویٰ۔ ورنہ لوگ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ ہم فتویٰ کے کسی طرح نہ مخالف ہیں نہ اس کے منکر، ہم خود اگر اس مسند پر ہوتے تو غالباً وہی لکھتے جو دارالافتاء نے لکھا ہے۔ کیوں کہ فتویٰ کا مدار استفتاء پر ہے ”جیسی روح ویسا فرشتہ“، مستفتی نے جو کام کیا ہے وہ غلط ہے۔ دارالافتاء نے جو کیا وہ غلط نہیں۔ غالباً اب تو علماء حضرات کو بھی یہ بات درست محسوس ہو رہی ہوگی۔ غلط اقدام کی ہم دو وجہ تحریر کرتے ہیں۔

طلب فتویٰ غلط اقدام تھا

وجہ اول: اگر حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال واقعتاً قابل اعتراض تھے جیسا کہ دارالعلوم کا موقف ہے اور معترض کا خیال ہے تو خود قائل سے اولاً معنی معلوم کیا جاتا یا دیگر علماء

حضرات سے معلوم کیا جاتا اور سب مل کر اس کی کوئی صحیح تاویل کرتے جیسے شریعت و دین کی تعلیم ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲ پر تو معاملہ اور مسئلہ اس قدر زور نہ پکڑتا۔ بلکہ جنہیں حضرت مولانا کے اقوال پر اعتراضات تھے وہ خود ان ہی حضرات علماء دیوبند سے رو برو جا کر اس کی درخواست کرتے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں وہ ہمیں دین و شریعت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھا دیجئے یا ان کی کچھ تاویل کر کے بتائیے جس سے ذہن قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

اور اگر روبرو نہ بھی جاتے بلکہ اسی دارالافتاء میں تحریراً خط ارسال کرتے اور مطالبہ بس اسی کا کرتے جو اوپر ذکر ہوا اور اس میں ایک جملہ یہ بڑھا دیتے کہ ہمیں اس کا حکم یا فتویٰ مطلوب نہیں ہے ہمیں تو صرف درست معنی و تاویل درکار ہے تو یقیناً دارالعلوم وہ فتویٰ نہ دیتا جو دیا گیا نتیجہ یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ ثابت ہوا کہ خیانت کا ارتکاب ہوا ہے۔ دراصل لوگ غلط کام کر کے دارالافتاء کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں ”بلی کا بکرا“ بناتے ہیں جیسا کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی ہے فرمایا ”يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا قَوْلَنَا جَسَدًا لَّهُمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ“ ہم نے اس کو اور جگہ بھی لکھا ہے۔

وجہ ثانی: جب قائل کا کوئی قول فعل بین خلاف شرع ہو۔ جیسا کہ مولانا محمد سعد صاحب کا قول ”ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی“ تو بالکل ظاہری بات ہے آنکھ بند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا صحیح ہونا قرآن وحدیث سے کسی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ وہ ایسا بین خلاف شرع ہے جس کا غلط ہونا نہ صرف علماء حضرات سمجھ سکتے ہیں بلکہ عوام کا لانا عام بھی سمجھ سکتے ہیں، اس کو مزید آسان مثال میں یوں سمجھیے فرض کیجیے گویا حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ”بلا وضو نماز جائز ہے“

اب اس کو تو مکتب پڑھا ہوا ہر بچہ بھی سمجھ لے گا کہ یہ غلط ہے۔ تو اب

ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی

عرض یہ ہے کہ ایسے واضح مسئلہ کو دارالافتاء لیجانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جب حکم معلوم ہے کہ بلا وضو نماز جائز نہیں اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ دارالافتاء میں کوئی نامعلوم معاملہ حکم معلوم کرنے کی غرض سے لے جایا جاتا ہے اور یہاں تو پہلے سے معلوم ہے۔ معلوم ہوا حکم معلوم کرنا غرض نہیں تھی بلکہ فاسد غرض تھی۔ اور اگر معترض وغیرہ یہ کہے کہ نہیں دارالافتاء لیجانے کی ضرورت تھی چاہے حکم معلوم تھا اور وہ ضرورت ہے، یہ معلوم کرنا کہ ایسے قائل کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ پس اگر یہ غرض تھی تو خیانت اور فاسد غرض واضح ہو چکی کیوں کہ آپ اس تاویل کو نہیں چاہتے جس تاویل کی ضرورت ہم نے پہلے بتائی ہے۔

پھر بھی ہم اس ضرورت کا بھی انکار ثابت کیے دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ دارالافتاء لیجانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی پھر واضح ہو جا گا کہ ہمارا دعویٰ ”طلب فتویٰ غلط اقدام تھا“ اور ”ضرورت تھی وجہ قول معلوم کرنے کی“ صحیح ہے اور طالب کی خیانت بھی واضح ہو جائے۔ وہ ضرورت کا انکار یہ کہ ہر ذی شعور شخص اتنی بات تو ضرور سمجھتا ہے کہ جو بات بین خلاف شرع ہو مثلاً ”بلا وضو نماز جائز نہیں ہے“ ایسی بین خلاف شرع بات بچہ بھی نہیں کہہ سکتا، اسے نیند سے اٹھا کر پوچھیں تب بھی ایک ہی رٹ لگائے گا کہ نماز جائز نہیں تو یہاں غور کی بات یہ ہے کہ جو بات ایک کم سن بچہ نہیں کہہ سکتا آخر اتنا بڑا آدمی ”حضرت مولانا محمد سعد صاحب“ کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا مولانا کو اتنا چھوٹا مسئلہ بھی معلوم نہیں؟ یا معلوم ہے لیکن انہیں اپنی عزت کا ذرا خیال نہیں یعنی بالکل نا سمجھ ہیں کہ ان پر گراہی کا حکم لگ سکتا ہے، چلیے اُس وقت اپنے درجہ اور مرتبہ کا لحاظ یاد نہیں رہا، اب تو اپنی مخالفت کے ڈر سے مان لیتے۔ لیکن ابھی بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس قول کی کوئی خاص وجہ ہے ضرور اس میں کوئی راز مخفی ہے۔

ایسی صورت حال میں قول (اقوال) اہم نہیں ہوتا کیوں کہ قول تو بچہ بھی جانتا ہے بلکہ وجہ قول اہم ہوتی ہے کہ آخر کس وجہ سے وہ ایسا کہہ رہے ہیں؟ جیسا کہ ذکر کردہ ”رجال دین کے اقوال میں“ وہ اقوال اہم نہیں تھے بلکہ ان کی وجوہ اہم تھیں۔ جس جس وجہ سے اور جس پس منظر میں انہوں نے وہ اقوال اختیار کیے وہ باعث تھے ان اقوال کے لیے۔ خلاصہ یہ کہ لوگ اس کو اہمیت دے رہے ہیں کہ مولانا محمد سعد صاحب نے ایسا ایسا کہا، حالانکہ وہ اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی، ضرورت اس کی تھی کہ وجہ قول اور منشا قول کو معلوم کیا جاتا۔

اب ظاہری بات ہے کہ کسی نامعلوم قول ”ایسا کہا“ کا جواب تو دارالافتاء کے پاس ہے، لیکن وجہ قول ”ایسا کیوں کہا“ کا جواب کسی بھی دارالافتاء کے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ وجہ قول تو صرف قائل ہی بتا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دارالافتاء سے قول کا جواب تو مل سکتا ہے لیکن وہ یہاں مطلوب نہیں بلکہ مطلوب وجہ قول ہے لیکن وہ دارالافتاء کے پاس موجود نہیں۔ تو پھر دارالافتاء لیجانا غلط ہوا۔ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ ضرورت وجہ قول معلوم کرنے کی تھی۔ اب یہاں کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ وجہ قول کیوں اہم ہے؟ تو اس کا جواب اس لیے کہ قول کی بنا ”وجہ قول“ پر ہوتی ہے اور ہر قول کا باعث اس کی بنا ہوتا ہے۔

اگرچہ اکثر علماء حضرات کے نزدیک تو اقوال اہم ہوتے ہیں، لیکن ان علماء حضرات سے پوچھیے جن کی نظر اصول شریعت پر ہے، اصولین کے یہاں اقوال سے زیادہ وجوہ اقوال اہم ہوتے ہیں۔ اور ہر قائل و فاعل کے پاس وجہ قول و فعل ضرور ہوتی ہے ”لِكُلِّ قَائِلٍ جِهَةٌ“ جس پر وہ عمل پیرا ہوتا ہے۔ جب وجہ قول ہو پھر وہ عمل کیوں اختیار نہ کرے۔ ”كُلُّ يَعْجَلُ عَلَى شَأْنِكَلَّتِهِ، كُلُّ أَنَايِسٍ مَّشَرَّ بِهْمٍ، وَكُلُّ حَزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔“

وجہ قول معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ

یہاں مستفتی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے طلب فتویٰ کے اقدام کو غلط بتایا اور وجہ قول معلوم کرنے کی ضرورت سمجھائی تو ٹھیک ہے لیکن حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے وجہ قول کیسے معلوم کریں جب کہ وہ کسی سے ملتے ہیں نہیں اور بیانات میں بھی وجہ قول بتاتے ہیں نہیں؟ تو ہم ایک اور طریقہ بتاتے ہیں لیکن پہلے یہ بھی معذرت کر لیں کہ وہ نہیں ملتے تو آپ ان سے بدظن نہ ہوں، جب وہ اتنا بڑا کام لے کر بیٹھے ہیں ہر کسی سے ملتے رہیں تو کام کیسے ہوگا؟ دنیا میں ہر چھوٹا بڑا شخص اپنی ذمہ داری میں مصروف ہوتا ہے جس میں ملنا قانون کے خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے۔ خیر اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح وجہ قول، قائل کی زبانی بتانے سے معلوم ہوتی ہے اس طرح اس کی زندگی کے شب و روز کے احوال و معمولات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ قائل کے اقوال جمیعہ و افعال جمیعہ اس کی زندگی کی شرح مکشوف و مفتوح کتاب ہوتی ہے۔

اصحاب متون کی عبارتوں کا ذوق جب شرح سمجھ لیتے ہیں تو متعلق مقامات پر ماتن کی ترجمانی اس کی کتاب کے کلمات و اقوال کا سہارا لے کر ہی کر لیا کرتے ہیں کہ ماتن کی مراد اس سے کیا ہے۔ لہذا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے زندگی کے بین گوشے آپ کی یہ طلب و اس بھی پوری کریں گے اگر آپ صحیح راہ پر ہیں۔ مطلب متکلم و قائل کے عقائد، اس کے فرائض اسلامیہ کی ادائیگی، اس کی سنن و آداب کی رعایت اس کے شب و روز کے معمولات اس کی فکر و سوچ اس کے غیر متعین کلام کی مراد کے تعین میں معین و مددگار ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا جس ”اصلاح و تربیت“ کے مسند پر ہیں اس مسند کو سامنے رکھ کر ان کے اقوال کی تشریح کی جائے جس طرح اہل تصوف کی مسند وغیرہ کو ملحوظ رکھ کر ان کے اقوال کی توجیہ کی جاتی ہے تو ان کے اقوال کی صحیح مراد فوراً سمجھ آ جائے گی۔

افسوس دار الافتاء سے نہ ہوسکا !

سابقہ مضامین و لاحقہ مباحث کے پیش نظر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن صرف اظہار حق کے طور پر نہ کہ اپنے بڑوں سے ٹکراؤ میں کہ جن استفتاءات کا تذکرہ درالعلوم دیوبند کے دار الافتاء نے کیا ہے جس کے رد عمل میں جو تاریخی فتویٰ جاری کیا اس سے قبل یہی کام کرنا چاہیے تھا کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تشریح و تاویل ان کی زندگی کی مفتوح کتاب سے کی جاتی اور مسائل کو مطمئن واپس کیا جاتا جس سے سارا مسئلہ و فتنہ ہی دب جاتا لیکن افسوس یہ نہ ہوسکا سب سے بڑی بات سمجھنے کی یہی ہے۔ ہاں دار الافتاء سے نہ ہوسکا یہ کوئی خرابی کی بات نہیں کیوں کہ جب ایک امام مجتہد سے خطا ممکن ہے تو مقلد کی کیا حیثیت، لیکن ہاں اس میں فتنہ سے بچاؤ تھا جس فتنہ سے بچاؤ کے لیے بہت سی ایسی شرعی توسعات کھل جاتی ہیں جو پہلے ممنوعات کی بندھن میں بند ہوتی ہیں۔ نیز یہ چیز مسئلہ کے تفقہ سے متعلق بھی نہیں بلکہ خارج از مسئلہ ہے۔ ضرورت صرف پیش آمدہ مسئلہ میں تنقیظ کی تھی جس کے فوت ہونے پر مسئلہ اٹھا۔ یہ ہے ہمارا خیال۔ (واللہ اعلم)

مذکورہ بات ضروری اس لیے تھی کہ مفتیان کرام پر بھاری ذمہ داری ہے، وہ کوئی معمولی منصب نہیں ہے کہ اس میں کوتاہی برتی جائے ورنہ عمل کا گناہ ان پر عائد ہوگا۔ اسی بھاری ذمہ داری کو ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف و ڈر کے اسلوب میں یوں بیان کیا ہے ”وَمِنْ ثَمَرِ اِسْتِدْلَ خَوْفِ السَّلَفِ مِنَ الْاِفْتَاءِ فَكَثُرَ اَمْتِنَاعُهُمْ مِنْهُ“ (مرقات ۱۲/۳۱۴ باب العلم) یعنی اسلاف رحمہ اللہ تعالیٰ انہی بھاری ذمہ داریوں کی وجہ سے بذات خود بھی مسند افتاء پر بیٹھنے سے بچتے تھے بلکہ دیگر لوگوں کو بھی بکثرت روکا کرتے تھے۔ اور امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مہذب میں فرماتے ہیں ”اَعْلَمُ أَنَّ الْاِفْتَاءَ عَظِيمُ الْخَطَرِ، قَدَائِرُ الْمَوْجِعِ، كَثِيرُ الْفَضْلِ“۔

(اصول الافتاء ۱۲ عن امام النووی)

جب مفتی کوئی ایسا استفتاء پائے جس کے جواب پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو کئی طرح کی حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے، تاکہ فتنہ و شر سے حفاظت ہو جائے مثلاً صریح جواب کو چھوڑ کر مجمل جواب پر اکتفاء کرنا۔۔۔ بلکہ علماء اسلام نے عام اہل علم اہل فتویٰ کو جو خصوصی ہدایات دیں ہیں اس کے پیش نظر مخاطب کا۔ چاہے خطاباً ہو کہ تحریراً ہو۔ جواب یا فتویٰ مؤخر کر کے چھٹکارہ پالے۔۔۔ یا بالکل ہی فتویٰ موقوف کر دے تاکہ جواب مفید ثابت ہو یا کم از کم دفع شر کا یقین حاصل ہو۔۔۔ اور ضرورت پڑنے پر جواب کو مؤخر کر کے اس کی ذہن سازی بھی کر سکتا ہے بلکہ کرنا چاہیے۔ اس کی ضرورت شریعت نے اس لیے جتنائی کہ بعض سائل یا بعض مستفتی حق جاننے اور اس پر عمل کے لیے مسئلہ نہیں لاتے بلکہ فتنہ کھڑا کرنے کے لیے لاتے ہیں اور وہ اس کا بوجھ عالم یا مفتی پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہم نے بتایا ہے یا بعض ایسی غلط نیت تو نہیں رکھتے ان کا ارادہ تو صالح ہوتا ہے لیکن وہ کم سمجھ ہوتے ہیں پھر پوچھے مسئلہ سے جواب پر کوئی اور شخص فتنہ اٹھا کر اسے ہوا دینے لگتا ہے بالآخر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے جیسا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں ہوا۔

صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی ہدایت کو بیان کیا ہے۔۔۔ ”وَهَذِهِ طَرِيقَةٌ عَلَى كُلِّ ذِي عَقْلٍ أَنْ يَسْلُكَهَا مَعَ الْجَهْلَةِ وَالْفَسَقَةِ إِذَا اسْتَفْتَاهُ وَاحِدٌ مِنْهُمْ أَنْ يَقْدِمَ إِلَّا رِشَادًا وَالتَّصِيحَةَ أَوَّلًا وَيَدْعُوهُ إِلَى مَا هُوَ أَوْلَى بِهِ وَأَوْجَبُهُ عَلَيْهِ حَتَّى اسْتَفْتَاهُ فِيهِ ثُمَّ يُفْتِيهِ“ (روح المعانی ۱۲/۵۸۸) یہاں زیادہ غور کی بات یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہم السلام نے تو توحید کی دعوت کے لیے جواب مؤخر کیا تھا جب کہ مسئلہ مذکورہ میں مسلمانوں کو یعنی اہل توحید کو دین پر جمانے یعنی فتنہ سے بچانے کے لیے یہ کام کرنا تھا جو پہلے کے مقابلے میں اہم ہے۔ کیوں کہ کسی مسلمان کو اسلام پر جمانا بنسبت غیر مسلم کو اسلام پر لانے سے مقدم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں تو دارالعلوم کا فتویٰ بھی قابل اعتبار نہیں رہتا باوجودیکہ جواباً وہ درست ہے مگر یہ کہ مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی تاویل ہی کا راستہ، صحیح راستہ تھا۔

عدم سبقت ذہن اور تاویلات سے غفلت

ہم حضرات علمائے دیوبند دامت برکاتہم سے اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں اور نظر انصاف قائم رکھتے ہیں کہ ہم یہ کہنے پر کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ جب ہم حضرات علماء دارالعلوم کو حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے مقابل کھڑا کریں اور فیصلہ لیں تو یقیناً حضرات علماء دیوبند قابل ترجیح ہیں کیوں کہ نسبت علم ان ہی کی طرف واضح ہے جب کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف غیر واضح۔ لیکن دین و شریعت پر اور اشخاص دین و شریعت پر وسیع نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے، کہ دینی مختلف شعبوں کے حاملین میں بھی کچھ دوری بنی رہتی ہے چاہے یہ بات دور حاضر کی ہو کہ دور ماضی کی چنانچہ دور ماضی کے بارے میں حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”أَلَا خْتِلَافٌ بَيْنَ الْمُتَصَوِّفَةِ وَأَصْحَابِ الْعُلُومِ الظَّاهِرَةِ“۔۔۔ (شرح نزہۃ النظر ۱۱۷، ۱۱۸)

نیز ویسے بھی دلوں کی خرابی اور نیتوں کی کھوٹ ہر زمانہ میں ہر چھوٹے بڑے سے کم و بیش ظاہر ہوتی ہے حتیٰ کہ ہجرت جیسے بڑے عمل میں بھی جیسا کہ ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ کا شان و رود ہے سوائے خلافت راشدہ نصف اول کے زمانہ کے لوگوں سے کہ اس زمانہ کی خصوصیات میں ایک تو یہی ہے کہ وہ دلوں کی خرابی سے بالکل دور تھے۔ اور دوسری اشاعت اسلام ہے۔

بایں وجہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی صحیح تاویل ”قصداً نہیں“ بلکہ فطری اس دوری کی بنا پر بوجہ عدم سبقت ذہن نہ ہو سکی ہو اور اس میں وہی وجہ کارفرما ہوں جن کا ذکر ایک اور جگہ ہوا ہے یعنی عدم تیقظ، غلو فی الاحتیاط اور دعوت کی حقیقت سے نا آشنائی بایں وجہ دارالعلوم کا فتویٰ قابل غیر ترجیح بن جاتا ہے۔

عدم سبقت ذہن ہی رائج ہے

اگر عدم سبقت کی بات کے رد میں کوئی کہے کہ علمائے دیوبند حضرات کا فتویٰ مستقل علماء حضرات کی ایک جماعت کے ذریعہ مرتب ہوا ہے اس میں عدم سبقت کی گنجائش نہیں ہے جو لکھا وہ بجا ہے لہذا مسئلہ کے عدم وضاحت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ تو ہم کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ دستخط کنندہ علماء حضرات پر تاویل واضح ہو چکی ہو لیکن زور دفتر اور اس کے وزن کی وجہ سے کرباً دستخط ہوئی ہو۔ ”کَمَا هُوَ الْمَتَعَارَفُ“۔ یہ بات بھی صرف احتمال کی فہرست میں آنے کی وجہ سے ہے نہ کہ یقین والزام کے درجہ میں۔ نیز مذکورہ بات کے رد میں ہم یہ بھی کہیں گے کہ مان لیا سب ہی نے دستخط طوعاً ہی کی ہے لیکن پوری جماعت پر مسئلہ کی عدم وضاحت کی بات کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔

کیوں کہ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ تو صرف ایک چھوٹی اور قلیل جماعت کا مسئلہ ہے کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوا ہے کہ پوری جماعت پر بھی مسئلہ مشتبہ رہے کیوں کہ پوری جماعت متقدمین پر بھی مسئلہ مشتبہ رہنے کی نظیر ہمارے پاس ہے کہ جو مسئلہ متقدمین پر مشتبہ رہا وہ متاخرین پر واضح ہوا، اور وہ مسئلہ ہے آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان و عدم ایمان کا، چنانچہ صاحب مظاہر حق علامہ قطب الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں ”۔۔۔ یہ بات گویا پہلے زمانہ کے علماء سے چھپی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے بعد کے علماء پر اسے ظاہر کر دیا“۔ (مظاہر حق جدید ۸/۲)۔ جس سے پھر یہ احتمال عود کر کے آجاتا ہے کہ صحیح تاویل میں سبقت ذہن نہ پائے جانے کی خطا ہوئی ہو اور مسئلہ عدم وضاحت کا شکار ہوا ہو۔ یہ سب احتمالات کے درجہ میں ہیں الزام کے درجہ میں ہرگز نہیں۔ ”واللہ اعلم بالصواب“

اور ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے جمہور کے خلاف اپنے مدعی پر صحیح روایات بھی نقل کی ہیں اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تین رسائل بھی تصنیف کیے ہیں۔ (مرقات ۴/۱۱۳) تو اب اس احتمال کو تسلیم کرنا ممکن ہو گیا۔ یقیناً ہرگز نہیں۔ کہ حضرات علماء دیوبند پر بھی تاریخی فتویٰ مشتبہ ہو گیا چاہے مشتبہ ہونے کی ماقبل میں ذکر کردہ وجوہات میں سے جو بھی رہی ہوں۔ مثلاً وجہ قول معلوم نہ کر سکتا۔۔۔ فتویٰ میں حکمت عملی کا ترک کرنا۔۔۔ علوم ظاہرہ و باطنہ میں دوری کی وجہ سے ذہن کا سبقت نہ کرنا۔۔۔ انتہائی حقیقت سے کام نہ لیا جانا۔۔۔ اور سب ہی علماء کا واضح شدہ حقیقت پر طوعاً مجتمع نہ ہونا وغیرہ۔

یاد رکھیے ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ یہ علماء دیوبند حضرات پر نہ الزام ہے نہ ان کو فتویٰ میں غلط بتانا ہے بلکہ ان کا فتویٰ بال کے برابر بھی شریعت سے ہٹ کر نہیں ہم اپنے علماء سے حسن ظن بھی رکھتے اور ان کے علم پر اعتماد بھی ”مَا اتَّخَذْنَاكَ وَرَاءَ ظَهْرٍ يَّ“ لیکن جو لکھا ہے وہ بھی احتمال کی صورتیں ہیں، انہیں زبردستی پیدا نہیں کیا گیا ہے جو ممکن حد تک ہو سکتی ہیں ان کو بیان کیا ہے یہ ایک ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی خاموشی کی وجہ

لوگ اس بارے میں بھی تردد میں ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب خاموش ہیں باوجودیکہ ان کے خلاف طوفان نوح کی طرح طوفان برپا ہے، وہ خود ہی مسئلہ کی وضاحت کیوں نہیں کر دیتے جس سے معاملہ ہی صاف بے غبار ہو جائے۔ تو آئیے ہم اس خاموشی کی تین وجوہات پیش کر دیتے ہیں۔

پہلی وجہ: درحقیقت حضرت مولانا محمد سعد صاحب اس بابت حضرات علماء دیوبند کے علم و فن کا ادب و لحاظ کرتے ہیں ان سے علمی لحاظ سے حسن ظن رکھتے ہیں اور گویا یوں سمجھتے ہیں کہ علوم ظاہرہ میں ہم چھوٹوں سے اگر کوئی اونچ نیچ اور کوئی کوتاہی ہو جائے تو یہ بڑے حضرات اسے نیٹ لیں گے ہمیشہ بڑے چھوٹوں کا اس طرح خیال رکھ لیا کرتے ہیں وہ چھوٹوں کو تنگ نہیں کرتے، ان کو اس کا حسن ظن ہے کہ ان کا علمی دامن نہ صرف وسیع ہے بلکہ عمیق بھی ہے، انہیں حضرات علمائے دیوبند کے وسیع و عریض علم و بصیرت پر اعتماد ہے اور نہ صرف انہیں بلکہ ہمیں بھی ہونا چاہیے۔ جب یہ بات ہے تو اب زبان کھولنا ادب و اعتماد کے خلاف ہوگا۔

اس حسن ظن و اعتماد کا تقاضہ تھا کہ حضرات علمائے دیوبند آتے اور پردہ اٹھاتے اور اعتماد کو پاش پاش ہونے سے بچا لیتے اور لوگوں کے سامنے عیاں کرتے کہ تم ایسے شخص کے بارے میں کس ذہنیت سے یہ اعتراضات اٹھاتے ہو جس کی زندگی ایک ایسی مکشوف کتاب ہے جس کا ہر ورق ہر سطر پوری دنیا پڑھ رہی ہے، وہ اور اس کی زندگی کوئی منظر مہدی کی طرح ”سَوْرَ مَجْ رَاي“ شہر کے سراوب میں مخفی تو نہیں۔ اس طرح وہ معاونت سے کام کو آگے بڑھاتے لیکن ”لَيْتَ الشَّبَابَ يَعُوْدُ“۔

دوسری وجہ: ہر میدان اور ہر مشن کا ایک دستور ہے کہ وہ اپنی دُھن اور تن من دھن سے منزل کی طرف آگے بڑھنے میں مصروف رہتے ہیں، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ہماری نجی حالتوں سے کس کو کتنی اور کیوں ناراضگی ہے، وہ ان سوالات کی طرف مطلق لیکن قصداً بر سبیل حکمت التفات نہیں کرتے تاکہ منزل کی طرف پیش قدمی اور ترقی میں کوئی کمی اور خلل واقع نہ ہو یہ عام مشن کا دستور ہے سوائے ”علم مناظرہ“ کے۔

تیسری وجہ: اس طرز عمل کو یعنی کنارہ کشی، خاموشی اور یکسوئی سے کام میں انہماک کو عام تہذیبی کتابوں میں اعلیٰ تہذیب اور خصوصاً کتب دینیہ و کتب اسلامیہ میں ”مقبول بندوں“ کی علامات میں شمار کیا گیا ہے دیکھیے حوالہ میں (معارف القرآن ۵۰۲، ۵۰۹)۔ پھر اس سعادت کو کیسے گنایا جاسکتا ہے!

منزل انتظار یعنی توجیہات کی جانب

ہمیں انتہائی حیرت ہے اس مسئلہ میں ”ضلالت“ جیسے لفظ کے استعمال پر، کوئی اور لفظ اور کوئی اور تعبیر بھی تو اختیار کی جاسکتی تھی جس سے سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی، کیا دبستان علم و ادب میں الفاظ کی کوئی کمی ہے یا مزاج فطرت میں کنجوسی ہے!! اور اس سے بڑھ کر حیرت بے پڑھے لکھے لوگوں کے بلا سوچے سمجھے ان کے رد عمل پر ہے کہ دارالعلوم سے فتویٰ کیا حاصل کیا کہ وہ اس کی اشاعت میں اس طرح مصروف ہو گئے گویا ان کے یہاں عند اللہ ہی سب سے بڑی قربت ہے!! اہل علم و فتویٰ کو یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ بعض لوگ ”ہمیں بلی کا بکرا“ بنانے کی فراق میں ہوتے ہیں، وہ مسئلہ پوچھ کر فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عقبہ بن مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول لوگوں کے اس طرح کے عمل کے بارے میں نقل کیا ہے فرمایا ”اَتَدْرِى مَا يَرِيْدُ هَؤُلَاءِ؟ يَرِيْدُوْنَ اَنْ يَّجْعَلُوْا ظُهُوْرَنَا لِهَؤُلَاءِ اِلٰى جَهَنَّمَ“ (اصول الافتاء ۱۳ عن جامع بيان العلم و فضلہ ۳۱۶)۔

ہمارا صحیح احساس یہ ہے کہ روزانہ کے مطالعہ کے بعد جہالت میں اضافہ نظر آتا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ آدمی صحیح معنی میں عالم اور مفتی اس دن کہلاتا ہے جس دن اس کا جنازہ اٹھتا ہے کیوں کہ اب مزید مطالعہ سے جہالت ظاہر ہونے کا دروازہ بند ہو گیا اور تو پچھلی زندگی کے علوم کا وہ عالم ہو گیا اس منزل پر پہنچنے کے بعد وہ اس کا مستحق بنتا ہے کہ اسے عالم و مفتی کہا جائے۔ لیکن افسوس وہ اب اپنے کو عالم یا مفتی سننے سے رہا۔ ذیل کے اقتباسات پڑھیے اور عبرت حاصل کیجیے۔

مقام عبرت

علم ایک ایسا سمندر ہے جو کسی شخص کی پوری زندگی ہڑپ کرنے جانے کے بعد بلکہ اپنی قیمت میں مجموعی کئی انسانوں کی زندگیاں لے لینے کے بعد بھی اپنا کنارہ نہیں دکھاتا، یہ ایک حقیقت ہے نہ کہ مبالغہ۔ حضرات اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ چکے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سہمے سہمائے ہوتے تھے۔ اور ان کی زبانوں پر تالے پڑے تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے احتیاط فی القرآن کی مثال دیکھیے، جب ان سے آیت قرآنی ”وَفَاكِهَةً وَأَبًّا“ میں ”لفظ اباً“ کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا اگر میں قرآن میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہ ہو تو نہ آسمان مجھے سایہ کرے اور نہ زمین مجھے اپنے پر جینے دے ” اَمَّنْ سَمَاءٍ تُطِلُّنِي وَأَمَّنْ اَرْضٍ تُقِلُّنِي اِذَا قُلْتُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَا اَعْلَمُ لِي بِهِ“ (مرقات ۳۱۲/۱)۔ علامہ زنجشیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ربیع الا برار میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس وقت سوال کیا گیا جب وہ منبر پر تھے تو جواب میں فرمایا میں نہیں جانتا تو سائل نے کہا منبر پر چڑھے ہو اور نہیں جانتا کہتے ہو! تو آپؐ نے فرمایا میں اپنے علم کے بقدر ہی چڑھا ہوں اگر اپنی جہالت کے بقدر چڑھتا تو آسمان تک چلا جاتا۔ ”اِنَّ عَلِيًّا كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ لَا اَدْرِي فَقِيلَ كَيْفَ تَقُولُ لَا اَدْرِي وَاَنْتَ طَلَعْتَ فَوْقَ الْمِنْبَرِ فَقَالَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّمَا طَلَعْتُ بِقَدْرِ عِلْمِي وَلَوْ طَلَعْتُ بِمِقْدَارِ جَهْلِي لَبَلَعْتُ السَّمَاءَ“ (مرقات ۳۱۲/۱)۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو کتنے سارے مسائل میں دوسرے حضرات سے جاننے کے بعد فرمایا ہے ”لَوْ لَا فُلَانٌ لَهْلَكَ عُمْرُ“ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ مہر کے مسئلہ میں ایک بڑھیا کے اختلاف کرنے اور اس سے مسئلہ جاننے پر فرمایا ”كُلُّ النَّاسِ اَعْلَمُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْعَجَائِزِ“ عام حضرات اس کو سیرت خلفائے راشدین (۷۰) پر دیکھ سکتے ہیں۔ جب امام مالکؒ سے ۴۰ مسائل پوچھے گئے تو انہوں نے صرف ۴ کے جوابات دیے اور بقیہ ۳۶ کے بارے میں فرمایا مجھے معلوم نہیں ”اِنَّ مَالِكًا لَّيَسْئَلُ عَنْ اَرْبَعَيْنِ مَسْئَلَةً فَاجَابَ عَنْ اَرْبَعَةٍ وَقَالَ فِي بَسِثٍ وَفَلَاثَيْنِ لَا اَدْرِي“ (مرقات ۳۱۲/۱)۔ یہ تو کچھ صرف فقہی جزئیات کے متعلق لاعلمی کا حال ہے اور وہ بھی اتنے بڑے حضرات کا، غور کیجیے پوری شریعت اور پورے دین کے علوم کے بارے میں اگر ان سے پوچھا جاتا تو کیا فرماتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں اس کا علم نہیں تھا، نہ وہ ان سے جاہل تھے، نہ وہ کتمان علم کے مرتکب تھے بلکہ وہ مناسب موقع کو سمجھتے تھے کہ کس وقت کس کے لیے کس جگہ کون سا مسئلہ بتانے کے لائق ہے اور کون سے مسئلہ میں خاموشی بہتر ہے جس کو صیانت علم کہتے ہیں تب ہی تو آدمی فقیہ بنتا ہے اور حکیم کہلاتا ہے بس یہی بات سمجھانے کے لیے یہ اقتباسات پیش کیے ہیں۔

اہل علم حضرات کی توجہ

اہل علم کی نظر کو اور ان کے علم کو چاہیے کہ ایک تو زبان عربی کی وسعت کو اور دوسرے علوم اسلامیہ کی عظیم وسعتوں کو اپنے زیر نظر اور زیر علم رکھے نہ صرف ان کی وسعتوں کو بلکہ ان کی گیرائی و گہرائی کو بھی اور بہ طور خاص ان علوم کی دو جانب یعنی دو قسموں کو بھی یعنی علوم ظاہرہ یعنی علم شریعت اور علوم باطنہ یعنی علم طریقت کو تا کہ کسی مسئلہ میں فیصلہ لینے میں نہ تردد کے شکار ہوں نہ پسپائی کے۔ لہذا ہم اس کے دونوں جز کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

علوم اسلامیہ کی وسعت و گہرائی کے شواہد

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث شریف ”لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ“ کے تحت علماء سلف و خلف کے اقوال بیان کیے ہیں۔ مثلاً ”قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ، لِكُلِّ آيَةٍ سِتُّونَ أَلْفَ فَهَمٍ“ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ”لَوْ شِئْتُ أَنْ أُوقِرَ سَبْعِينَ بَعِيرًا مِنْ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ لَفَعَلْتُ“ وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَا مِنْ آيَةٍ إِلَّا كَمَلُ بِهَا قَوْمٌ وَلَهَا قَوْمٌ سَيَعْمَلُونَ بِهَا“ (مرقات ۲۹۶/۱)۔ قَالَ بَعْضُ السَّلَفِ: سَلُونِي مَا شِئْتُمْ أُجِبْ لَكُمْ مِنَ الْقُرْآنِ (نبراس سرگودھا ۴۳۹)۔ شعر: بِجَمِيعِ الْعِلْمِ فِي الْقُرْآنِ وَلَكِنْ تَقَاصَرَ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَالِ۔ (نبراس)۔

ابونعیم میں حدیث شریف ہے ”الْقُرْآنُ ذُلُولٌ ذُو جُوهٍ فَاحْمِلُوهُ عَلَى أَحْسَنِ وُجُوهِهِ“ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح کی ہے ومعنی ذلول سَهْلٌ حِفْظُهُ وَفَهْمُهُ حَتَّى لَا يَقْصُرَ عَنْهُ أَفْهَامُ الْمُجْتَهِدِينَ، وَمَعْنَى ذُو جُوهٍ أَنَّ بَعْضَ جُحْلِهِ يَحْتَسِبُ وَجُوهًا مِنَ التَّأْوِيلِ --- وَمَعْنَى فَاحْمِلُوهُ الْحِمْْلَ أَحْسَنَ مَعَانِيهِ --- (مرقات ۲۹۲/۱)۔ وَلَيْذَا قَالَ الشَّافِعِيُّ: كُلُّ مَا حَكَمَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَهُوَ مِمَّا فَهِمَهُ مِنَ الْقُرْآنِ، وَقَالَ بِجَمِيعِ مَا تَقُولُهُ الْأَئِمَّةُ شَرْحٌ لِلْسَّنَةِ وَبِجَمِيعِ السَّنَةِ شَرْحٌ لِلْقُرْآنِ (مرقات ۲۴۰/۱) اور قرآن محکم کے بارے میں ہے ”لَا تَنْقُضِي عَجَائِبُهُ وَلَا يَخْلُقُ عَلَى كَثَرَةِ الرَّدِّ“

علوم اسلامیہ کی وسعت و گہرائی پر دال یہ اقوال آپ نے ملاحظہ فرمائے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی ایک مثال سے وضاحت بھی ہو جائے۔ تو ملاحظہ ہو قرآن حکیم کا ارشاد ہے ”إِنَّ

اللَّهُ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (سورۃ نساء ۱۱۶) علمائے متکلمین نے اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ”مَا دُونُ“ سے تین مسائل مستنبط کیے۔ (۱) گناہ کبیرہ مع التوبہ (۲) گناہ کبیرہ بلا توبہ (۳) گناہ صغیرہ۔ یہ تینوں معاف کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک مسئلہ ہوا۔ دوسرا مسئلہ: کبیرہ بلا توبہ کا معاف نہ کیا جاسکتا۔ تیسرا: گناہ صغیرہ پر بھی معاف نہ کرتے ہوئے سزا دیا جاسکتا۔ (شرح عقائد ۸۵/۸۶) آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ الفاظ قرآن میں کس قدر وسعت اور گہرائی ہوتی ہے۔ بس ہمیں اس طرح سمجھ سے کام لینا ہے۔

علوم قرآنی کی جو ترجمانی مذکورہ بالا اقوال میں کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی آب و تاب کے سامنے مادی آفتاب ماند، اس کی بلندیوں کے سامنے مادی آسمانوں کی بلندی نیچ اس کی گہرائی کے سامنے سمندر کی گہرائی معمولی ہے۔ یہ تو ان علوم کی وسعت و گہرائی کے شواہد تھے اب آئیے اس کی خصوصی و تقسیم معلوم کرتے ہیں۔

علوم ظاہرہ و باطنہ کی باریک نزاکتیں

علم ظاہر یعنی فقہ کا علم (شریعت) اور علم باطن یعنی تصوف وغیرہ کا علم (طریقت و تہذیب) دونوں ہی دین کے ایسے اجزاء ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کے ملانے سے ہی نہ صرف دین بتا اور سنورتا ہے بلکہ اسی سے حقیقت دین آشکارہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان کو جدا کر دے تو کیا حال ہوگا وہ ہم چند سطور کے بعد امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بتائیں گے۔ ہم پہلے دونوں کی طرف اشارہ کرنے والی حدیث پیش کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے ”الْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَاكَ حِجَّةُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ“۔ (رواہ الدارمی) جس میں علم قلب کو نافع اور علم لسان کو ابن آدم پر حجت بتایا گیا ہے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے دونوں کا محل اس طرح متعین کیا ہے کہ اول کا محل علم باطن ہے اور ثانی کا علم ظاہر۔ پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ علم باطن کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے جب ظاہر کی اصلاح ہو جیسا کہ علم ظاہر کی تمامیت اس وقت ہوتی ہے جب باطن کی بھی اصلاح ہو۔ دیکھیے دونوں کو جمع کرنے کی اہمیت ثابت ہوئی۔ اور امام مالکؒ مزید تفصیل سے یوں بیان کرتے ہیں ”قَالَ الْإِمَامُ مَالِكٌ : مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ، وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنَّدَقَ، وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ“ (مرقات ۱/۳۱۳)۔ یعنی فقہ (علم ظاہر) بغیر تصوف (علم باطن) کے فسق ہے اور تصوف بغیر فقہ کے زندقیت ہے اور دونوں کو یکجا کرنا حقیقت دین ہے۔ ابوطالب کی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ دونوں علم اصلی ہیں کوئی بھی دوسرے سے مستغنی نہیں۔ ملاحظہ فرمایا کہ دونوں علم مجتمع ہیں۔

سمجھیے کہ ان میں اجتماع بھی غضب کا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور ان میں افتراق بھی کم نہیں۔ اگر افتراق نہ ہوتا تو تقسیم وجود میں نہ آتی۔ لہذا ان میں اجتماع و افتراق دونوں ہیں۔ اس اجتماع و افتراق کو اس کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا اہل بصیرت کا کام ہے، یہ وہ پل صراط ہے جس پر سے گزرنا انہی کو میسر ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں علم چاٹنے میں صرف کی ہوں۔ عوام حضرات کو اسے سمجھے بغیر کسی بھی عالم دین کے بارے میں لب کشائی کرنا درست نہیں۔ ان کے اجتماع و افتراق کو آسانی سے سمجھنا ہو تو اسلام و ایمان کی مثال سے سمجھیے۔ لہذا علم ظاہر و باطن کے افتراق و اختلاف کو تقابل سمجھنا اور انہیں مقابل ٹھیرانا نہ صرف کم فہمی کم ظرفی ہے بلکہ کم علمی بھی ہے۔ کیوں کہ افتراق کے لیے تضاد ضروری نہیں کہ انہیں ایک دوسرے کا مقابل بنایا جائے مقابل بنانے کے لیے تضاد ضروری ہے۔ جیسے روشنی اور تاریکی اور آگ پانی۔ اسے ہم ایک آسان مثال سے سمجھاتے ہیں۔

افتراق بلا تضاد کی پہلی مثال

کوئی شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نماز (صفت احسان پر مشتمل) کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے یعنی فقہ سے منقول نماز (بلا خشوع) کو مقابل بنا کر (سلفی اہل حدیث) ہم سے پوچھ کر مغالطہ میں ڈالے کہ بتاؤ تم کوئی نماز درست مانتے ہو! غور کیجیے سائل نے دونوں علم کو تضاد پر محمول کر کے تقابل سے ہمیں تردد میں ڈال دیا کہ جو بھی جواب دیں وہ غلط ہو کیوں کہ وہ جواب بھی تقابل پر مشتمل ہوگا حالانکہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ افتراق ہے تقابل و تضاد تو بالکل نہیں، اور ان کے اصل اجتماع کو تو بالکل ہی فراموش کر دیا کیوں کہ جو نماز حضور سے منقول ہے وہی نماز امام اعظم سے منقول ہے۔ گویا اس نے دین و ایمان ہی کو داؤ پر لگایا، یہ بہت بڑی خیانت ہے۔

افتراق بلا تضاد کی دوسری مثال

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے جس نے خشوع اختیار نہیں کیا اس کی نماز فاسد ہے، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس نماز میں حضور قلب حاصل نہ ہو وہ اس کے لیے لائق سزا ہے نہ کہ لائق ثواب۔ (تعلیق الصبیح ۱/۳۶۶)۔ ان آثار سے خشوع کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا ثابت ہوا خشوع یعنی علم طریقت۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان آثار سے جو خشوع و حضور قلب فی الصلوٰۃ کا شرط ہونا معلوم ہوا وہ اجماع فقہاء کے خلاف ہے، کیوں کہ ان کے یہاں تو صرف بوقت تکبیر تحریمہ حضور قلب شرط ہے۔ خلاصہ یہ کہ فقہاء کے یہاں خشوع شرط نہیں یہ ہے شریعت۔ اور اصحاب آثار کے یہاں شرط ہے جس کے بغیر نماز درست نہیں یہ ہے طریقت۔ یہ افتراق ہے اجتماع نہیں رہا لیکن یہ افتراق تضاد کو مستلزم نہیں۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ افتراق سے تصادم و ٹکراؤ نہ ہوگا اور تضاد و تقابل سے تصادم لازمی طریقہ پر آئے گا۔

افتراق بلا تضاد کی تیسری مثال

ایک شخص نے حضرت ابن عمرؓ سے سوال کیا کہ کیا وتر واجب ہے (یا سنت ہے) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور مسلمانوں نے نماز وتر پڑھی ہے۔ صاحب مرقات فرماتے ہیں کہ انہوں نے صریح جواب نہیں دیا کہ ہاں واجب ہے (یا سنت ہے) بلکہ مواظبت بیان کی یعنی وجوب کی دلیل تو بیان کی لیکن اس کا مدلول (وجوب) بیان نہیں کیا۔ یہ بھی جواب کا ایک طریقہ ہوتا ہے کہ سوال تو حکم پر مشتمل ہو اور جواب حکم پر نہیں اس حکم کی دلیل پر مشتمل ہو۔

اس طرز عمل کی حکمت یہ ہے کہ کسی شئی پر کسی حکم کے صادر کرنے میں احتیاط کو برقرار رکھنا ہے، حدیث مذکورہ میں وہ احتیاط اس طرح کہ جب صاحب شریعت ﷺ نے وتر پر وجوب کا حکم ”صراحتاً“ صادر نہیں کیا تو ہم کیسے اس کو واجب کہیں! یہ تو بات ہوئی فقہاء کی اور شریعت کی کہ ان کے یہاں (احناف) وتر واجب ہے قطع نظر اس سے کہ حدیث میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ لیکن اب آئیے صوفیہ یعنی طریقت کی طرف، تو ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ جو طرز عمل راوی حدیث سے حاصل ہوا وہی صوفیہ کے یہاں مختار ہے، وہ کسی بھی شرعی عمل کو مواظبت سے کرنے کا اہتمام رکھتے ہیں قطع نظر اس سے کہ فقہاء کے یہاں یعنی شریعت میں وہ فرض ہو کہ سنت و مستحب۔ (مرقات ۱۷۵، ۳)۔

ان تینوں مثالوں کے بعد اب توجہ فرمائیں اس پر کہ کوئی شخص علم شریعت کا مسئلہ، علم طریقت کے پاس لے جائے یا اس کے برعکس کرے مثلاً دوسری مثال میں کوئی شخص دارالافتاء میں یہ مسئلہ لکھ بھیجے کہ ایک شخص کہتا ہے نماز میں خشوع فرض ہے ورنہ نماز فاسد ہوگی، یا تیسری

مثال میں لکھے کہ ایک شخص مستحب عمل پر بھی مواظبت کو ضروری سمجھتا ہے جس طرح فرض پران کا کیا حکم ہے؟ تو یہ دونوں علوم میں تصادم و تقابل کی صورت ہوگی اور ایک طرح کی دین میں خیانت بھی ہوگی، جس سے خرابی کا اور دو علوم کے لوگوں میں اختلاف و دوری کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہوگا اور اگر مستفتی اس سے فتنہ کھڑا کرنا چاہے تو بہ آسانی وہ اس میں کامیاب بھی ہوگا، کامیاب اس معنی کر کے اس کا الزام دارالافتاء پر ڈال دے گا۔

کیوں کہ جواب تو اسی سے حاصل کیا ہے، اور دارالافتاء جو بھی جواب دے گا وہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ اور صوفیہ کے خلاف ہوگا، چاہے استفتاء میں ان کا نام مبہم رکھا گیا ہے لیکن ان کے خلاف جواب حاصل کرنے کے بعد مستفتی نام کی صراحت کے ساتھ فتویٰ کی تشہیر کرے تو دارالافتاء اور صوفیہ اور دونوں تابعی حضرات میں تصادم و اختلاف ضرور ہوگا۔ لیکن یہ حربہ اتنا کارگر نہ ہوگا کیوں کہ وہ حضرات اس وقت دنیا میں دارالافتاء کی مخالفت کرنے کے لائق نہیں، لیکن انہی کی جگہ کسی زندہ شخصیت کو مقابل لاکر یہی صورت کوئی اختیار کرے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پھر کیا صورت بنے۔

دعوت و تبلیغ میں پیش آمدہ معاملہ میں تقریباً یہی صورت پیش آئی ہے، سمجھیے زندہ کی جو مثال فرض و تقدیر کی تھی وہ حقیقی اور وجودی میں ڈھل گئی۔ اس خرابی کی ایک وجہ یہی بنی کہ بہت سے حضرات نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی الگ الگ باتوں کو لے کر مثلاً موبائل کا مسئلہ، قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا مسئلہ، دعوت و تبلیغ کے کام کو ضروری بتانے کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ الگ الگ لوگوں نے اپنے اپنے علم و سمجھ سے لکھ کر مختلف استفتاءات کو دارالافتاء پہنچایا تو وہاں سے ان استفتاءات کے مطابق (مطابق فقہ حنفی) جو فتاویٰ آئے تو حضرت مولانا محمد سعد کے خلاف ایک تاریخی فتنہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ان کی آسمانوں کو چھونے والی قربانیوں کو یکسر بھلا دیا۔

یہ بات ہم نہ تو دارالافتاء کی مخالفت میں کہہ رہے ہیں نہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی محابات میں، اگر فی الواقع وہ غلطی پر ہوتے تو اس طرح کی کاروائی کو ہم بھی نہ صرف درست سمجھتے بلکہ ضروری بھی کہتے۔ بلکہ انہیں بھی ہم ادباً یہ کہیں گے مسائل کے بارے میں بین حلال یا بین حرام کہنا مناسب ہے کیوں کہ یہ شرعی اصطلاحات صرف ان ہی جگہوں کے ساتھ خاص ہیں جہاں شرعاً وہ امور حلال ہیں اور حرام ہیں ان کے علاوہ میں ان کا استعمال ”وَضْعُ الشَّيْ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ“ ہے۔

اس بارے میں تمام لوگوں سے اور کسی قدر مستفتیان سے جو اصولی غلطی ہوئی وہ یہی کہ انہوں نے شریعت و طریقت دو الگ الگ نظریوں کو اور ان کے الگ الگ ٹھکانوں یعنی مدارس اور دعوت و تبلیغ کے مرکز کو ان کے نظریات میں پائی جانے والی جہت افتراق بلا تضاد کو افتراق بالضد سمجھا، یا ان کی جہت اجتماع کو ملحوظ رکھ کر آپس میں مزاحم سمجھا، جب کہ ایسی صورت میں جہت اجتماع کو نظر انداز کر کے جہت افتراق بلا تضاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر طلب فتویٰ کے بجائے تاویلات دریافت کرنے کی ضرورت تھی چاہے پھر علماء مدارس ہی سے سہی، ہم نے اس بحث کے شروع ہی میں لکھا ہے کہ ان کے درمیان پائی جانے والی دونوں جہتیں یعنی اجتماع و افتراق کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ دونوں جہتیں موقع و محل کے لحاظ سے اختیار کرنی چاہیے، کیوں کہ حدود فقہ صرف ظاہر تک ہیں یعنی فقہاء صرف ظاہر میں تصرف کرتے ہیں علم باطن میں وہ تصرف نہیں کرتے، ہاں وہ باطنی احوال سے بے نصیب و محروم بھی نہیں رہتے، اور علم طریقت والوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ ظاہر سے زیادہ باطن کو غایت سمجھتے ہیں۔ لہذا ایسی صورت میں فیصلہ بھی بہت احتیاط سے لیا جانا چاہیے۔

تنبیہ : اہل علم حضرات کو ایسی صورت میں نہایت ہی تہیظ سے کام لینا چاہیے، اور جس

طرح فتویٰ کے لیے وہ فقہی جزئیات کو مصادر سمجھتے ہیں اسی طرح سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض مسائل میں یعنی حالات میں اپنا مصدر سمجھنا چاہیے جس پر خود فقہ مبنی ہے، کیوں کہ سیرت بیک وقت فقہ اور حکمت دونوں پر مشتمل ہوتی ہے جو بڑے سنگین حالات کو بھی ایک طرف کر کے راستہ دکھاتی ہے۔ جس طرح خود فقہ مشکل حالات میں اپنا راستہ ”الضَّرُورَاتُ تُبَدِّلُ الْمَحْظُورَاتِ“ کہہ کر نکال دیتا ہے۔ جب اپنا راستہ نکال سکتے ہیں تو اوروں کا بھی تو نکال سکتے ہیں۔

تنبیہ نمبر دو : کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے ان سے حاصل مخفی باریک اشارات اگر مراد لیے جائیں۔ جیسا کہ اہل تصوف مراد لیتے ہیں۔ جس سے نصوص کے ظاہری معنی کی تردید و نفی لازم نہ آئے تو یہ طرز عمل نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ تو کمال ایمان اور اعلیٰ معرفت کی بات ہے۔ کیوں کہ اس کی دونوں مرادوں میں تطبیق ممکن ہوتی ہے ”تَنَكُّشُ عَلَى آرَبَابِ السُّلُوكِ يُمَكِّنُ التَّطَبُّعَ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَ الظَّوَاهِرِ الْمَرَادَةِ فَهَوَ مِنْ كَمَالِ الْإِيمَانِ وَفَحْضُ الْعِرْفَانِ“ (شرح عقائد ۱۲۰)۔

چنانچہ حکیم الامت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر ”بیان القرآن“ میں لطائف السلوک اس کی مثال ہے۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی فکر و سوچ اور ان کے اقوال کا حال بھی اسی طرح کا ہے۔ فندبر۔ ہاں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ ”شریعت“ جو نہ صرف مقدم ہے بلکہ اصل ہے اس کا ترک لازم نہ آئے۔ ہم ذیل میں ایک دو اور مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ آئندہ بھی اس طرح کا مسئلہ کسی کے بارے میں پیش نہ آوے۔

افتراق بلا تضاد کی چوتھی مثال

واقعہ مشہور ہے حیاۃ الصحابہ میں بھی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر زہد کارنگ

غالب تھا، حتیٰ کہ انہیں مدینہ المنورہ بھی چھوڑنا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ ادائیگی زکات کے بعد بھی آدمی کے لیے اس کا پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے اس کے لیے استعمال جائز نہیں۔ (حیۃ الصحابہ ۳۳۲/۲ مترجم)۔ اب بتائیے کہ اگر کوئی شخص نام مبہم رکھ کر مسئلہ کا فتویٰ طلب کرے تو دارالافتاء کا ہر مفتی دستخط کے ساتھ یہ تحریر کرے گا کہ جو شخص یہ کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے نہ پورا مال صدقہ کرنا ضروری نہ اس کے لیے استعمال کی ممانعت۔ اب اگر فتویٰ ہاتھ میں لے کر پھر نام ظاہر کرے کہ یہ ابو ذریٰضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ تو اب صحابی کو غلط کہیں گے۔ العیاذ باللہ۔ یا دارالافتاء کے فتویٰ کو؟ ظاہری بات ہے نہ فتویٰ غلط ہے نہ صحابی کا قول غلط بلکہ اب راستہ دونوں میں تاویل کا ہے۔ لیکن تاویل آنے تک تو دونوں میں سے کسی ایک کی طرف غلطی منسوب ضرور ہوگی۔ اس کا ذمہ دار کون؟ صحابیؓ یا دارالافتاء یا وہ جس نے مسئلہ کو دارالافتاء پہنچایا؟

افتراق بلا تضاد کی پانچویں مثال

حیۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم میں ہے، حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک مرتبہ جب کھاتے دیکھا تو فرمایا عائشہ ایک دن میں ایک مرتبہ سے زیادہ یعنی دو مرتبہ کھانا اسراف ہے۔ (حیۃ الصحابہ گجراتی ۵۱۲/۲)۔ اب اس میں بھی مستفتی نام مبہم رکھ کر فتویٰ پوچھے کہ ایک شخص ایک دن میں دو مرتبہ کھانے کو اسراف کہتا ہے جو حرام ہے تو کیا یہ اسراف ہے؟ اور یہ فعل حرام ہے؟ تو سارے مفتیان یہ لکھیں گے کہ نہ ایسا کھانا اسراف ہے نہ حرام ہے۔ اور وہ شخص اپنے قول میں غلط ہے۔ جب فتویٰ مرتب ہو کر نام ظاہر کرے اور خود مفتیان سے اس کا تذکرہ کرے کہ یہ فرمان کسی اور کا نہیں خود حضور ﷺ کا ہے تو شاید ان کی جان ہی نکل جائے اور وہ اپنے ایمان کی تجدید کو ضروری سمجھیں۔ اب اگر وہ لوگوں میں جا کر یہ کہے کہ انہوں نے حضور

ﷺ کے قول کو غلط بتایا۔ العیاذ باللہ۔ اور آپ ﷺ کو جھوٹا بتایا اور دستخط شدہ فتویٰ بھی اس لیے بتائے تاکہ لوگوں کو یقین ہو تو لوگوں کا کیا حال بنے! ایسا ہی جیسا حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال سے بنا ہے۔ حالاں کہ حضور ﷺ کا فرمان بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور فتویٰ بھی غلط نہیں ہے۔ غور و توجہ کی بات یہ ہے کہ ایک بھی غلط نہیں دونوں ہی باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں پھر بھی ”فتنہ“ جنم لے رہا ہے، اگر ایک بھی بات غلط ہو اور فتنہ ہو تو افسوس کی بات نہ ہو لیکن کس قدر افسوس کی بات ہو جب دونوں صحیح ہوں اور فتنہ ایسا جنم لے کہ لوگوں کا دین خطرے میں پڑ جائے۔ دراصل خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا فتویٰ طلب کیا جائے کیوں کہ فرمان نبوی کا تعلق اصحاب زہد سے ہے وہ وہاں تک رہنا چاہیے جب اسے دارالافتاء کھینچ کر لایا جائے تو یقیناً فتویٰ اور قول رسول، اور قول صحابی میں تضاد پیش آنے کی صورت بنے گی اور لوگوں کا دین اور ان کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ لوگ بس اس طرح خیانت کرتے ہیں اور ان کی خیانت سے دارالافتاء بدنام ہوتا ہے۔ لہذا سیرت پر نظر رکھنے سے حکمتیں ہاتھ لگتیں ہیں اور مشکل حالات میں راہ نظر آتی ہے۔

رجال دین کے اقوال کی توجیہات

ہم نے ان رجال دین کے اقوال پر اعتراضات پیش کرنے کے وقت ہی یہ کہا تھا ذرا یاد کیجیے کہ یہ ایسے اقوال ہیں جن کی صحت پر قرآن و حدیث کی نصوص پیش نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ یہ بین خلاف شرع ہیں اور بین خلاف شرع قول کی دلیل شرع (قرآن و حدیث) میں کیسے ہو سکتی ہے، کیوں کہ شرع میں دلیل ہو تو بین خلاف شرع نہ رہے۔ دوسری بات کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے کچھ اقوال کو بھی ہم نے بین خلاف شرع مانا ہے، لہذا آگے ان کے اقوال کی

صحت ثابت کرنے میں بھی قرآن وحدیث سے استدلال ممکن نہ ہوگا۔ لہذا جو طریقہ رجال دین کے اقوال کے لیے ہوگا یعنی توجیہات وتاویلات وہی طریقہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کے لیے ہوگا۔ اس سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ہونے کم از کم اس اعتراض کو تو واپس لینا ہی بہتر ہوگا کہ مولانا قرآن شریف کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں، کیوں کہ ہم نے یہ تسلیم کر ہی لیا ہے کہ ان کے کچھ اقوال بین خلاف شرع ہیں۔

بلکہ جہاں تک ہماری سوچ کا مسئلہ ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے تمام اقوال میں اگر کوئی قول سنگین ہے تو بس ایک دو ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام والا، ورنہ اس کے سوا سارے اقوال نہ سنگین ہیں نہ بین خلاف شرع۔ برخلاف اقوال رجال دین کے کہ ان میں اکثر بین خلاف شرع بھی ہیں اور سنگین بھی، لیکن پھر بھی ہم ان کی مناسب توجیہات پیش کر کے مسئلہ بے غبار کر دیں گے۔

اس کی کوشش اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں ان کے عقائد، ان کے اعمالِ آخرت وغیرہ سے۔۔ اطمینان ہے تو ان کی کتاب زندگی کو ملحوظ رکھ کر یقین کے ساتھ ہم کہتے ہیں کہ وہ راہ راست پر ہی تھے، راہ حق سے ذرہ بھی دور نہیں تھے۔ جب ہم یہ کام رجال دین کے لیے کر رہے ہیں تو اب ان تمام حضرات کو جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بارے میں منفی سوچ رکھتے ہیں انہیں بھی نہ صرف اس سوچ سے تائب ہونا چاہیے بلکہ جو ضرر پیش آیا ہے اس کی تلافی بھی کرنی چاہیے اور تلافی کی صورت یہی ہے کہ قابل اعتماد ذرائع سے ان کے بری ہونے کا اعلان کیا جائے۔ آپ کو یہ کام ضروری اس لیے ہو جاتا ہے کہ آپ کے سامنے حق بالکل اسی راستے آیا ہے جس راستے آنے کے آپ خواہش مند تھے یعنی آپ یہ سمجھتے تھے کہ ایسے اقوال کبھی بھی آدمی کو حق

پرستی پر باقی نہیں رکھ سکتے، لیکن رجال دین کے اقوال اور ان کی تاویلات سے ثابت ہو گیا کہ وہ حق پرستی پر تھے اور ہیں، بس اسی طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب حق پرست ہیں اور حق پرستی پر قائم ہیں۔ (واللہ خیر حافظا، واللہ علی ما نقول وکیل)

تاویلات وتوجیہات

توجیہات سے پہلے ہم آپ کو اہم بات بتادینا چاہیں گے جسے علمی سخاوت وفیاضیت سمجھیں جسے امام محی السنۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ انہوں نے اس بات کا پتہ دیا ہے کہ اس لے تو آئیے ہم ان مذکورہ بالا اقوال کی توجیہات پیش کریں۔ ہم بخدا کہتے ہیں یہ توجیہات اسلامی کتابوں سے پیش نہیں کر رہے ہیں (ہاں جو مل گئیں وہ نقل کی اس کا حوالہ آپ موجود پائیں گے) بلکہ ہم خود ہی اس سمجھ سے پیش کر رہے جو قرآن وحدیث کے پڑھنے پڑھانے سے اور دیگر اسلامی علوم مثلاً بلاغت وفقہ وغیرہ کی ممارست سے حاصل ہوتی ہے جس کا مشغلہ روزہ مرہ کا ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ شارحین کس ذوق سے ماتن کی تسامحات کو دفع کرتے اور کس طرح تشریح کرتے ہیں چاہے پھر جلالین ہو، مختصر المعانی ہو، شرح عقائد و شرح تہذیب ہو۔۔۔ اور پھر دیگر ہزاروں کتابوں کا ۴۰ سالہ مطالعہ ”نور علی نور“ کا مصداق ہو پھر دشواری کیسی؟ پچاس سال کھپانے کے بعد اتنا بھی نہ کر سکیں تو سودہ گھائے میں ہوگا۔ (سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا)

دراصل ہم نے اس پر توجہ نہیں دی کہ یہ رجال دین کیسی بڑی بات کہہ رہے ہیں جس سے ان پر کوئی سنگین حکم عائد ہو بلکہ اس وجہ قول پر توجہ دی جو اس قول کا باعث ہے، کہ ان رجال دین نے ایسی بات کیوں کہی، جب اس پر توجہ دی تو ان کا منصب دیکھا، ان کے کارنامے دیکھے، ان کا میدان عمل دیکھا۔۔۔ تو ان اقوال کی وہ توجیہات ہاتھ لگیں کہ غالب احتمال یہ ہے کہ اگر ان اقوال کی توجیہات خود انہی سے پوچھی جاتیں تو شاید یہی بتاتے جسے اس حقیر نے پیش کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

طرح کی توجیہات آدمی پر کب منکشف ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: ”وَقَدْ يَفْتَحُ اللَّهُ عَلَى الْمُدِيرِ وَالْمُتَفَكِّرِ مِنَ التَّأْوِيلِ وَالْمَعَانِي مَا لَا يَفْتَحُهُ عَلَى غَيْرِهِ. وَالتَّفَهُؤُ يَكُونُ بِصَدَقِ الْبَيِّنَةِ وَتَعْظِيمِ الْحُزْمَةِ وَطَيِّبِ الطُّعْمَةِ“ (مرقات ۱/۲۹۶)۔ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر تاویلات و معانی کا انکشاف فرماتے ہیں جو تدبر و تفکر اور تہیّظ و تعمق سے کام لے۔ غیر مدبر و متفکر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا اور فہم اس وقت کام کرتی ہے جب نیت صادق ہو اور تعظیم اعلیٰ درجہ کی ہو اور غذا پاکیزہ ہو۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ کے قول کی توجیہ: جس میں انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو انبیاء علیہم السلام کے مقام پر قرار دیا تھا۔ ”قَامَ أَبُو بَكْرٍ فِي الرِّدَّةِ مَقَامَ الْأَنْبِيَاءِ“۔

توجیہ نمبر ایک: یہ ایک تشبیہ ہے جیسے شجاعت میں زید کی اسد کے ساتھ، اور اس طرح کی تشبیہ سے حقیقت ثابت نہیں ہوتی تو یہ عمل جائز ہوگا لہذا اعتراض بھی نہ ہوگا اور قول کا مطلب ہوگا ”كَانَ فِعْلُهُ (فعل قتال المرتدین) كَفِعْلِ النَّبِيِّ“۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو: کسی امتی سے کسی عظیم کام کے صدور میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت ذات۔ دوسری جہت امت۔ چنانچہ ولی سے صدور کرامت میں علماء اسلام نے یہی بات کہی ہے کہ کسی ولی سے کرامت کے صدور میں دخل ولی کی ذات سے زیادہ اس کے نبی کا ہے، جب نبی ہی کی جہت غالب ہے یا اس کا دخل ہے تو انبیاء علیہم السلام کے مقام پر ہونے میں کون سے اعتراض کی بات ہے! (واللہ اعلم) ولی اور کرامت کی بات کا حوالہ (شرح عقائد ۱۰۷)۔

توجیہ نمبر تین: علماء حضرات وارثین انبیاء علیہم السلام ہیں، لہذا کسی وارث کا مورث کے مقام پر کھڑے ہو کر کوئی کام انجام دینا خود اس کا مقتضی ہے، نہ کہ اس کا مزاحم۔ لہذا مضاف الیہ کی

تقدیر ہے آجی ”مَقَامَ وَارِثِ الْأَنْبِيَاءِ“۔ اور ابو بکرؓ تو علماء سے بڑھ کر خلفاء میں سے ہیں پھر خلیفہ کا اپنے اصل کے مقام پر کھڑا ہونا خلافت کا تقاضہ ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ: حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”غیر نبی کو نبی کے ساتھ تشبیہ کیوں کر حاصل ہو“ میں اس کی تفصیل کی ہے جو ہماری تینوں توجیہات پر منطبق ہوتی ہے آپ حوالہ سے مراجعت فرمائیں (ازالہ اخلافا مترجم ۱۰۳)۔

(۲) حضرت علیؓ کے قول کی توجیہ: قول تھا کہ جن لوگوں کی نمازوں میں وساوس و خیالات نہ ہوں وہ یہودی و نصاریٰ کی نمازیں ہیں۔

توجیہ نمبر ایک: یہ ان تکلف پرستوں سے ہمیں آگاہ کرنا ہے جو بدباطن ہیں لیکن لوگوں کی نظروں میں ظاہری اچھے حال کو اختیار کر کے اپنا مقام چاہتے ہیں جس کے لیے وہ بتکلف خشوع اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں میں چاہے وہ وساوس نہ ہوں (جو سادہ مخلص شخص کی نماز میں از خود پیدا ہو جاتے ہیں) پھر بھی ان کی نمازیں یہود و نصاریٰ کی نمازوں کے مشابہ ہیں۔ تو یہود و نصاریٰ کی نمازوں کے ساتھ اصل تشبیہ ان ریاکار لوگوں کی نماز کو دی گئی ہے کیوں کہ وہ بتکلف ظاہری حال کو اچھا رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی مخلص لوگوں کی نمازوں میں تو صرف ایک عضو ”قلب“ کا فعل نامناسب ہے کہ اس میں وسوسہ آتا ہے اور وہ بھی بلا تکلف برخلاف ریاکاروں کے کہ ان کی تو پوری نماز ہی یعنی پورا جسم ہی ارادہ بدکار ہے۔ خلاصہ یہ کہ مدح و تعریف کے راستہ برا اور برائی کے راستہ اچھا کہا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کی علمی بلندی اور فراست کو دیکھتے ہوئے یہ توجیہ بچ رہی ہے۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو: یہ اثر و خبر ”ذَٰكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ“ کے تحت منقول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس

کے اندر ایمان کی دولت ہو اس میں وسوسہ ایمان کی علامت ہے، شیطان اسی دولت کو لوٹنے کے لیے دل پر حملہ کرتا ہے۔ ورنہ کافر کے پاس کوئی دولت ہی نہیں تو حملہ کا اور وسوسہ کا خطرہ ہی کہاں، اسی وجہ سے یہ کہاوت مشہور ہے۔ ”الْلُّصُّ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ الْحَلَالِي“۔ (مرقات ۱/۱۳۶)

(۳) سید الطائفہ شیخ جیلانی کے قول کی توجیہ : انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم بحر معرفت میں اس قدر داخل ہو گئے کہ انبیاء علیہم السلام کنارے پر کھڑے رہ گئے۔

توجیہ نمبر ایک : ہم تو اعتراض کے خلاف یہ سمجھتے ہیں کہ یہی قول دلیل ہے اس کی کہ انہیں نبی سے کم معرفت حاصل ہے۔ پھر تو اعتراض ہی منہدم ہو جائے گا کیسے؟ ملاحظہ ہو یہ بات یقینی ہے کہ نبی کو خدا کی جو خشیت حاصل ہوتی ہے وہ امتی سے زیادہ ہوتی ہے ”إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَآتَقَاكُمْ“ لہذا نبی پر بنسبت امتی کے خدا کی ہیبت زیادہ ہوگی، پھر تو امتی اپنی کم حاصل خشیت و ہیبت کے باعث اس مقام پر داخل ہو یہ ممکن ہے جس مقام پر نبی زیادہ ہیبت کے باعث نہ جاسکے۔ جس طرح نا سمجھ بچہ اور اس کے سمجھدار باپ کا حال۔ بات واضح ہو گئی کہ نبی کو ہی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے تو اعتراض ختم ہو گیا۔ نیز حدیث شریف میں ”علم کا لفظ بھی دیکھا ہے۔“ اَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ وَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ“ جب نبی کا فرمان ہی ہے کہ میں خدا کو تم سے زیادہ جانتا ہوں تو پھر مذکورہ توجیہ یقین کے درجہ میں ہوگی۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر دو : صاحب نبراس علامہ محمد عبدالعزیز فرہاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سمندر میں داخل ہونے سے مراد ایسے احوال ہیں جن کا انبیاء علیہم السلام سے صدور عوام کے نزدیک غیر مناسب متصور ہوتے ہیں جیسے وجد و رقص وغیرہ باوجودیکہ انبیاء علیہم السلام میں عشق و ذوق کے سمندر بہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایسے احوال سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ (نبراس ۳۶۶) (واللہ اعلم)

نوٹ : آپ ان توجیہات کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک حضرت علامہ کی دوسری اس عبداللہ کی یا تو دونوں برابر درجہ کی ہیں یا ممکن ہے اس عبداللہ کی توجیہ وزنی ہو کیوں کہ اس میں یا تو عدم انشاء اعتراض ہے یا استدلال بالحدیث بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس کو آپ عجب پر محمول نہ کریں یہی علامہ عبدالعزیز، صاحب ہدایہ، علامہ تفتازانی، ملا علی قاری اور امام رازی ہیں اور ان جیسے دیگر چند مصنفین ہیں جنہوں نے اس بندہ کو ذوق و شعور اور تقیظ دیا ہے تو ان کے نقش قدم کا اتباع ہو پھر تعجب کیسے اور عجب کیسے جس کے صدقے کچھ کام کر لیا کرتا ہے۔ مذکورہ توجیہ کی طرح یہ عبداللہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی بھی تسلی بخش بفضل خدا توجیہات پیش کرے گا۔

(۴) سید الطائفہ شیخ جیلانی کا دوسرا قول : یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نام نبوت دیا گیا اور ہمیں اس سے روک دیا گیا لیکن نبوت کا لقب ہمیں ضرور دیا گیا، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے رسول کے کلام کے اسرار سے ہمیں باخبر کیا ہے جس مقام کو ”اولیاء کے انبیاء“ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لقب ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔ (نبراس مولوی برخوردار حاشیہ ۶ کتاب ۴۴۵) کتاب میں اس کی توجیہ موجود نہیں۔ اللہ ہمیں درست فہم نصیب فرمائیں۔

توجیہ : اس توجیہ میں دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ لقب کیوں دیا گیا اور نام سے کیوں روکا گیا۔ دوسرا ان کو لقب میں کیوں انبیاء کہا گیا؟ یہی دوسری چیز قابل اعتراض ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ لقب کا مسئلہ اسم کے خلاف ہے، کیوں کہ لقب کا تعلق صاحب لقب کے علاوہ سے ہو کر اس سے ملقب کیا جاتا ہے جیسے کہ مذکورہ جملے میں ”اولیاء“ کی طرف منسوب ہو کر ان کے انبیاء کہا گیا ہے جس میں منسوب الیہ سے قرب و تعلق بتلانا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں جو دو نسبتیں (ولایت و نبوت) ہوتی ہیں ان میں ہمیں نسبت ولایت سے نوازا گیا ہے چاہے اسی میں شامل نسبت نبوت کے نام سے محروم کیا گیا ہے۔

اب دوسری چیز سمجھیے ”اولیاء کے انبیاء“ جو لقب دیا گیا ہے اس سے یہ شبہ نہ کریں کہ یہ کیسے درست ہے جب اسم نبی سے روکا گیا ہے پھر یہاں انبیاء کیسے؟ کیوں کہ یہاں اصطلاحی انبیاء مراد نہیں بلکہ لغوی انبیاء مراد ہے۔ جو نبی سے مشتق ہے جس کے معنی خبر دینے اور پیغام پہنچانے کے ہیں یہی اعتراض کا جواب ہے اب کوئی اعتراض نہیں رہے گا، اب مطلب ہوگا جس طرح انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچاتے ہیں ہم یعنی بڑے منصب ولایت کے حامل اولیاء اپنے ماتحت اصحاب ولایت کے حق میں انبیاء یعنی پیغام پہنچانے والے ”لغوی“ انبیاء ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ شیخ کے جملے میں یہ الفاظ ہیں ”ہمیں ضرور اسرار سے باخبر کیا جاتا ہے۔“ (واللہ اعلم)

(۵) منصور حلاجؒ کا قول انا الحق کی توجیہ نمبر ایک : جب معرفت خداوندی کے مقام میں بہت آگے بڑھ گئے اور اپنی ذات فنا کر دی تو پھر انہیں خدا کی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تو فرمانے لگے ”انا الحق“ یہ انا الحق اسی وجود خداوندی کے پرتو کی طرف نظر کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے نہ کہ اپنی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے کیوں کہ وہ فنا ہو چکی تھی تو پھر اس منزل پر کچھ بچا ہی نہیں تو یہی کہا جاسکتا ہے اس کے سوا کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں بچتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر خلق ہر شیء میں موجود ہے یعنی اس کا پرتو، جب یہ پرتو غالب ہو جائے تو پھر یہ حالت پیش آتی ہے ا۔ (واللہ اعلم)

ا۔ ہم نے اپنی مطبوعہ کتاب ”نہج الائمہ فی اصلاح الائمہ“ میں پیرومید کی معرفت میں فرق عنوان کے تحت امام رازی کے حوالے سے جو بات لکھی ہے وہ بھی قول مذکورہ کی مؤید ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ابو القاسم قشیریؒ نے محققین کا قول شیخ ابوسعید رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نقل فرمایا ”مَا زَايَنَّا شَيْئًا إِلَّا وَرَايَنَّا اللَّهَ بَعْدَهُ“ تو شیخ ابوسعید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ذَلِكَ مَقَامُ الْمُرِيدِينَ“ پھر انہوں نے مرشدین کا ملین کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا ”فَاِنَّهُمْ مَا زَاوَا شَيْئًا إِلَّا وَكَانُوا اَقْدَرَاُ وَاللَّهُ قَبْلَهُ“ دیکھیے مرشدین تو خلق سے پہلے ہی اس میں خالق کا پرتو دیکھ لیتے ہیں کس قدر بصیرت حاصل ہوگی ! (نہج الائمہ فی اصلاح الائمہ ۸۳/۳) الحمد للہ یہ وہ کتاب ہے جس کو بڑے علماء حضرات نے ”تصنیف“ فرمایا اور لکھا ہے۔ جس کے ۶۰۰ صفحات ہیں، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب دامت برکاتہم وراہم دارالعلوم دیوبند کو ہاتھ در ہاتھ دی ہے ہماری سنوی تعطیلات شعبان ۱۴۱۸ء میں۔

توجیہ نمبر دو : توجیہ تو وہی ہے لیکن ہم اسے کتابی اصطلاح میں ڈھال کر یوں پیش کرتے ہیں۔ مخلوقات ممکن الوجود ہیں اور اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں، اور واجب کے مقابلہ میں ممکن بمنزلہ عدم ہوتا ہے لہذا انہیں صرف خدا کا پرتو اور اس کا وجود واجب ہی نظر آیا اس لیے ”انا الحق“ فرمایا۔ (واللہ اعلم)

(۶) اہل تصوف کے قول کی توجیہ : اہل تصوف یعنی اہل علم طریقت کا ذکر مثالوں کے ساتھ گزر چکا ہے جس سے کافی بات سمجھ لی گئی ہوگی تاہم اپنا فریضہ ادا کر لیتے ہیں۔ اعتراض تھا کہ اہل تصوف اور ادا کا اہتمام فرض کے اہتمام کی طرح کرتے ہیں اور اس کے چھوڑنے کو فرائض چھوڑنے کے برابر سمجھتے ہیں۔ توجیہ یہ ہے کہ وہ اصلاح ظاہر کے ساتھ اصلاح باطن پر زور زیادہ دیتے ہیں، اس لیے وہ لوگوں کو ایسی عادت پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ اور ادونوافل عادت سی بن جائیں جنہیں عادت چھوڑنا اس طرح شاق ہو جس طرح فرائض کو چھوڑنا شاق ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اور ادونوافل کو فرائض کا درجہ شرعی طور پر دینا مقصود نہیں بلکہ ریاضت سے حاصل مزاج و طبیعت کے لحاظ سے مقصود ہے۔ کہ طبیعت خود ان کو چھوڑنا فرائض کے چھوڑنے کی طرح ناپسند کرے۔ لہذا ان کا مقصد شرعی نوافل و فرائض کے درجات سے نہ کوئی مزاحمت ہے نہ مداخلت۔ اور لعنت سے مراد بھی شرعی نہیں بلکہ اہل تصوف کی نگاہوں سے ”لغوی“ دوری مراد ہے۔ اور مندوب پر اصرار شیطان کا حصہ اس وقت بنتا جب ”مندوب“ پر اصرار فرائض و مندوب کی حقیقت سے ناواقف ہو کر دونوں میں ”نظری“ طور پر غلط کرتا، لیکن یہاں ایسا اس لیے نہیں کہ وہ شرعاً دونوں کو علی حدہ سمجھتا ہے۔

(۷) قرآن حکیم کی مثال کی توجیہ : حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ستارے سورج کو ”

ربی“ کہنا۔

توجیہ : یہ توجیہ خود مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے مختصر جملے میں اس طرح پیش کی ہے کہ اعتراض ہی وارد نہ ہو وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن بے ایمانوں سے مخاطب تھے وہ ستاروں یا سورج کے ماننے والے تھے یا ان کا خیال ان کے معبود کا تھا تو ان مخاطب لوگوں کے عقیدہ و خیال کے مطابق ”ربی“ کہا تھا اپنے عقیدہ کے مطابق نہیں اور شروع میں ہمزہ استفہام مخروف ہے ”أَهَذَا رَبِّي فِي زَعْمِكُمْ“ (شرح عقائد ۱۳۳ ازبراس) تاکہ ان کے غروب کے وقت یہ سمجھایا جاسکے کہ اس میں رب ہونے کی صلاحیت ہی نہیں۔

نیز آگے آیت شریفہ میں ”فَلَمَّا أَفْلَكَ قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي--“ خود حکایتاً عن ابراہیم ”إِنِّي بُرِّئُ“ ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے ”ربی“ کہنا اپنی جانب سے تھا ہی نہیں یہ بات ”هَئِذَا تُشْرِكُونَ“ کا جملہ بتاتا ہے۔ پھر اعتراض واقع ہونے کا کوئی مقام ہی نہیں البتہ ظاہر میں شبہ تھا تو مفسرین نے ”بزعم مخالف“ کی تشریح سے دفن کر دیا۔ (واللہ اعلم)

(۸) جمعیت و پارلمینٹ کے پلیٹ فارم پر اعتراض کی توجیہ : اس کی توجیہ بالکل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے مسئلہ کی توجیہ کی طرح ہے۔ کیوں کہ یہاں بھی مخاطب مشرک و کافر ہیں جیسے وہاں تھے۔

(۹) امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے قول کی توجیہ : جب اس کا سیاق و سباق دیکھا تو مسئلہ حل ہو گیا وہ یہ کہ عشق خدا میں منزل کی طرف بڑھنے میں ہمت و عزیمت کے اقدام کے لیے اور اس میں جان پیدا کرنے کے لیے ہے کہ اس کے قرب کی طرف ہمیشہ ہمارا سفر جاری رہے کسی منزل پر دم تو لے لیں لیکن رک نہ جائیں اور سفر کو ملتوی نہ کیا جائے۔ (تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد ۳۲۲)۔ مطلب صرف راہ عشق میں ماسوا اللہ کا مشغلہ گناہ ہے یہ ہر شخص کے بارے میں نہیں تو پھر اس میں کس کو اعتراض ہے!

رجال دین کے اقوال کی یہ تاویلات ہیں۔ ایسا نہیں کہ اتنے ہی اقوال ہیں، اعتراضات کی باتیں تو قدم قدم پر پیش آتی ہیں لیکن تاویل کر کے گزر جانا ہوتا ہے وہاں ”ٹھہر کر“ سوچنا اور فیصلہ لینا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ہم اور مثالیں پیش کر دیتے ہیں آپ سوچتے رہیں۔ مثلاً

(۱) حدیث شریف میں ہے۔ ”أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ يَا بِلَالُ بِمَ سَبَقْتَنِي إِلَى الْجَنَّةِ“ (ترمذی ۲۰۹۲)۔ سوال: حضرت بلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے جنت میں کیسے؟ کیا یہ تنقیص ہے؟

(۲) حدیث شریف میں ہے ”إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخَافُ مِنْكَ يَا عُمَرُ“ (ترمذی ۲۱۰۲)۔ یہاں بھی سوال ہے۔

(۳) مسلم عقیدہ ہے کہ امام مہدی امامت کرائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے۔ (شرح عقائد ۱۰۱)۔ نبی کی امامت غیر نبی کیسے کرا سکتا ہے؟

(۴) حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی قوم کی دعوت پر ملت کفر میں ”بذریعہ مشیت خدا“ لوٹنے کی بات کہی، یہ کیسے ممکن ہے؟ ”وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ (سورہ اعراف ۸۹)۔

(۵) ”وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ“ (سورہ)۔ ایمان و شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں پھر مؤمنین کو مشرکین کہنا کیسے درست ہے؟ اس طرح کے سوالات تو بے شمار ہیں لیکن سوالات اٹھانا کمال نہیں ان کو حل کرنا کمال ہے۔

نوٹ : ہم یہاں ایک لطیفہ یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ اس طرح کی باتوں پر اعتراض کرنا یا ان کی تاویل کرنا کوئی مشکل کام نہیں علماء حضرات تو جانتے ہی ہیں۔ عوام بھی سمجھتے ہیں۔ ہمیں

حضرت مولانا محمد سعد صاحب سے عقیدت مند شخص نے کہا کہ لوگ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں اگر ہم بھی ان پر اعتراض کرنا چاہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن خواہ مخواہ دین برباد کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم ہی نے پوچھا، مثلاً کیا؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگ ”منتخب احادیث“ کتاب کی تعلیم سے روکتے ہیں تو ان پر حدیث شریف (کی کتاب اور وہ بھی مستند کتاب) پڑھنے سے روکنے کا اعتراض لازم آیا یہ کتنا بڑا گناہ ہے؟ بلکہ اس پر دوسرا اعتراض بنتا ہے ہم نے پوچھا کون سا؟ تو کہا کہ جس چیز کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں اس کے انکار پر اتنا اصرار خلاف شریعت ہے ہاں اگر دینی ضرر ہو تو الگ بات ہے یہاں تو دینی فائدہ ہے پھر بھی اس کے انکار پر حرام و ناجائز پر انکار کی طرح قائم رہنا یہ خود غیر شریعت کو شریعت سمجھنا ہے کیا یہ دین میں مداخلت کے مرادف نہیں؟ معلوم ہوا۔ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی باتیں کوئی گمراہی کی نہیں وہ اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں البتہ اسے اس نظریہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے

حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ہوئے اعتراضات کے جوابات

یارب صل وسلم دائماً ابداً علی حبیبک خیر الخلق کلہم
لکھنے اور پڑھنے سے پہلے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ دعوت و تبلیغ کے میدان میں موجودہ فتنہ سے نکلنے کی صورت پیدا فرماویں، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کب یہ نہیں چاہتے کہ امت اس سے نہ نکلے، آدمی اس کے لئے رات بھر عبادت اور اس کی دعا کرتا رہے لیکن دعا سے فارغ ہو کر کوشش نہ کرے تو شاید وہ کامیاب نہ ہو کیوں کہ کوشش شرط ہے۔ جو اسباب میں سے ہے اور اسی اعتراض کے جواب کا تو قرضہ ہم پر ہے۔

اب کیا کوشش کرے؟ جواب کوشش یہ کرے کہ دل کو ذاتی اغراض سے پاک کر لے پھر حق بات کو تلاش کرے، پھر حق بات کو چاہے کڑوی ہو قبول کرے یہ ہے کوشش ورنہ اللہ تعالیٰ

کسی کا ہاتھ پکڑ کر نہ حق پر کھڑا کریں گے اور نہ اس فتنہ سے نکالیں گے۔ ابوطالب کی یہی خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہے انہوں نے ذاتی غرض نہیں چھوڑی، ایک طرف آں حضرت ﷺ دعوت دیتے، دوسری طرف قوم عار دلاتی جس کی وجہ سے وہ کلمہ نہ پڑھ سکے بالآخر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ میں عار کو اختیار کرتا ہوں اور اسے جہنم پر ترجیح دیتا ہوں ”اِخْتَوْتُ الْعَارَ عَلَى النَّارِ“ جب بندہ خود ہدایت نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے چاہیں گے!! یہی عار ہے جو آدمی کو دین پر چلنے سے بھی مانع ہوتی ہے اور حق کو قبول کرنے سے دور رکھتی ہے، چاہے پھر کسی بھی قسم کی عار ہو۔ ”اللھم احفظنا من ذلک“۔

لہذا حق اختیار کر کے ہر مسلمان سے اس طرح محبت، اکرام، ہمدردی اور خیر خواہی سے پیش آئے جس طرح ہمارے دین کا تقاضہ ہے۔ بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح کہ ”اللہ تعالیٰ کے سامنے روؤ اور اگر رو نہ آئے تو بتکلف روؤ یعنی رونے کی شکل ہی بناؤ بس ہر مسلمان بھائی سے اکرام و خیر خواہی سے پیش آؤ نفس مانے تب بھی نہ مانے تب بھی۔

حضرت ملا علی قاری۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے انتہائی بڑی بات لکھی ہے آپ تصور کریں کہ ثقلین یعنی تمام مسلمان جنات اور تمام مسلمان انسان کے اچھے کاموں کا مجموعہ کتنا بڑا ہوگا اس مجموعہ کو ایک طرف رکھو اور کسی مسلمان کے دل کو خوش کرنے کا عمل ایک طرف رکھو۔ تو مسلمان کو خوش کرنے کا عمل بڑھ جائے گا! یہ ہے مسلمان کی شان اس پر عمل کر کے دیکھیے۔ ”تَطْيِيبُ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ أَفْضَلُ مِنْ عَمَلِ الثَّقَلَيْنِ“ (مرقات شرح مشکوٰۃ ۴/۴۴)۔

جوابات سے پہلے انتہائی اہم امور و اصول

حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گئے ۷۰ اعتراضات کے سیدھے جوابات / توجیہات سے پہلے ہر قاری و معترض کو ذیل کے اہم ترین امور بلکہ کیسے اصول ضرور ملحوظ رکھنے

چاہیں، جن کے بغیر توجیہات کو پڑھنا ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ یہ وہ اہم امور ہیں جنہیں اگر آپ نے سمجھ لیا تو شاید آپ توجیہات کے منتظر نہ رہیں۔

(۱) سائل یعنی معترض نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کو لے کر خواہ مخواہ ۷۰ اعتراضات دکھا کر مسئلہ کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ یہ ۷۰ اعتراضات تین قسم میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

☆ اصل قابل اعتراضات مولانا کے صرف ۸/۱۰ اقوال ہی ہیں۔

قابل اعتراض بالترتیب یہ ہیں: نمبر ۱۔ نمبر ۲۔ نمبر ۱۴۔ نمبر ۱۸۔ نمبر ۲۸۔ نمبر ۳۳۔ نمبر ۳۵۔ نمبر ۶۳۔ نمبر ۶۴۔ بقیہ اس لئے قابل اعتراض نہیں ہیں کہ اکثر ان کی حالت یکساں ہے، صرف الفاظ کی تبدیلی سے شمار کو بڑھا دیا ہے۔

☆ بعض اعتراضات کی عبارات میں (حکایت عن مولانا محمد سعد صاحب) ”عندی“ کی قید موجود ہے۔ جس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ معترض اتنا ناقص فہم ناقص علم ہے کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ مولانا اس لفظ سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ قول میرا ذاتی رجحان ہے میں اسے دوسروں پر لازم نہیں سمجھتا۔ جب یہ بات ہے تو اسے لے کر اعتراض کی اور اچھالنے کی گنجائش کہاں؟ معترض اگر یہ بات نہیں جانتا تو اس کی عقل و علم پر ماتم کی ضرورت ہے اور اگر جانتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ صالح لہ نہیں ہے اور یہ ایک قسم کی خیانت ہے۔ مثلاً وہ نمبر ہیں ۳۔ ۴۔ ۹۔ ۱۳۔ ۱۹۔ ۲۲۔ ۶۸۔

بلکہ اگر کتابی اصول کو دیکھا جائے کہ بعض دفع متکلم مصنف کسی قید کو اختصار یا ضرورت قلیلہ کے پیش نظر حذف کر دیتا ہے باوجودیکہ وہ معنوں و ملحوظ ہوتی ہے تو جن جگہوں میں یہ قید نہیں انہیں بھی اس قید سے متصف مان لیں پھر تو اعتراضات کی اکثر کڑیاں ٹوٹ کر چند ہی عدد میں محصور ہو جائیں گی۔ بس یہیں سے حضرت مولانا محمد سعد

صاحب پر اعتراض کا حال ”کمثل العنکبوت“ واضح ہو گیا۔

☆ بعض عبارات و اقوال کو اعتراضات کا ہدف بنا کر ان کی نسبت حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف جوئی گئی ہے وہ درحقیقت حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے اقوال ہیں۔ لہذا ان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی طرف اعتراض کی نسبت غلط ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۷۰ اعتراضات میں یہ تین باتیں ملحوظ رہیں اور یہ بھی کہ اب صرف ۸/۱۰ اعتراضات کے جوابات ہی مطلوب رہے۔

(۲) کسی فکر و تحریک یا اس کے سربراہ پر محض ظاہری چند اقوال کی بنا پر ضلالت یا ضال کا یا اس کے اندیشہ کا حکم لگانا۔ جو ایک سنگین حکم ہے۔ اس حکم کے لگانے سے پہلے اس پر تحقیقی نظر۔ نہ کہ سرسری۔ ڈالنا ضروری ہے کہ مشبہ بہ اور مشبہ دونوں میں علت کس قدر مشترک ہے، کیوں کہ اتحاد حکم کے لیے اتحاد علت ضروری ہے اگر دونوں میں علت متحد نہیں تو آپ کا اعتراض آپ کا فیصلہ غلط ہوگا۔

اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جن جماعتوں پر ضلالت کا حکم لگایا گیا ہے۔ ان میں معیار ”مَا آتَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابُہِ“ اور معرفت الہیہ میں حق تک رسائی ہے۔ کیوں کہ معرفت الہیہ کو یعنی علم توحید و صفات کو علم شریعت و احکام کی بنیاد بتایا گیا ہے (شرح عقائد ۲)۔ یہی بات علمائے اسلام نے لکھی ہے، ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ شرح عقائد میں ہے ”۔۔۔

وَذٰلِكَ لِقُصُوْرٍ نَّظَرٍ هُمْ فِي الْمَعَارِفِ الْاِلٰهِيَّةِ۔۔۔ (۶ شرح عقائد)۔ اور روح المعانی میں لکھا ہے ”وَقَالَ الرَّاعِبِيُّ: اَي مَاعَرَفُوْا كُنْهَهُ عَزَّوَجَلَّ وَتَعَقَّبَ بِاَنَّ مَعْرِفَةَ كُنْهِهِ تَعَالٰی اَي حَقِيقَتِهِ سُبْحَانَهُ لَا يَخْصُ هُوْلَاءِ لِتَعَدُّرِ لَوْ قُوفٍ عَلٰی الْحَقِیْقَةِ۔۔۔ وَ قَبِلَ الضَّبِيْرُ لِلْيَهُودِ تَكَلُّمًا فِي صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ جَلَالِہِ

فَالْحُدُوءُ وَجَسْبُهُ وَاجَاءُ الْبِكْلِ تَخْلِيْطٌ“ فنزلت وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ“

(روح المعانی ۲۳/۲۴ صفحہ ۳۸۲)۔

جب کہ یہاں تو مشبہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی باتیں اعلیٰ معرفت کی ایسی ہیں جیسی مشائخ تصوف کی۔ اور ”مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي“ کو دیکھیں تو اہل حق کے جتنے عقائد ہیں ان میں سے ایک بھی عقیدہ ایسا نہیں جس کی مخالفت مولانا کے قول سے کوئی ثابت کر سکے۔ رہے وہ اقوال جنہیں مدار اعتراضات بنایا گیا ہے وہ ان عقائد کے ضمن میں شامل ہی نہیں جو مدار ضلالت ہیں جنہیں بڑے علماء حضرات جانتے ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے جو فرمایا جس کی ترجمانی حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہے ”جن مسائل کی آیات کریمہ نے صراحت کی ہے (مسائل منصوصہ) اور ساتھ ہی وہ احادیث مبارکہ سے اور سلف کے اعمال سے بھی ثابت ہے ان میں اختلاف ”اہل حق“ کا معیار نہیں، ان کو ماننے والے اور نہ ماننے والے سب اہل السنہ والجماعہ ہیں، کیوں کہ ایسا کرنے کا حق ہر ایک کو ہے۔ مثلاً ضروریات دین کا انکار لازم نہ آئے مثلاً فرضیت صلوٰۃ کا انکار اور ختم نبوت کا انکار نہ کرے وہ اہل حق ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱۴۲/۱۴۲)۔

اور ہمارے پاس اس کا قرینہ بھی موجود ہے، وہ ہے حضرت مولانا محمد سعد صاحب اور ان کے متبعین کے دینی اور مذہبی احوال اور اعمال۔ اگر ان کے مذہبی احوال واقعہ اور اعمال دیکھیں، ان کی عبادات، ان کا زہد و تقویٰ، ان کے اخلاق و کردار، ان کی صفات، ان میں فرائض شرعیہ و سنن و آداب کی رعایت، ان کی دینی قربانیاں، ان کی شب و روز کی مصروفیات، ان کے بیانات اور اپنے متبعین کو تعلیم وغیرہ، تو کبھی خواب میں بھی ضلالت یا شبہ ضلالت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

بلکہ بیداری کی حالت میں اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے کہ وہ سب ایسی روحانی

طاقت پر مشتمل ہیں کہ اگر راستہ میں پہاڑ آجائے تو وہ جگہ دے دے ”وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُوِّدَتْ بِهٖ الْجِبَالُ“ اور مردہ میں جان ڈال دے۔ کیوں کہ حدیث شریف میں ہے ”اِذَا سَمِعْتُمْ بِمَجْلٍ زَالَ عَنْ مَّكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ، وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ فَإِنَّهٗ يَصِيْبُ اِلٰی مَا جِئِلَ عَلَيْهِ“ (مشکوٰۃ شریف ۲۴)۔ مذکورہ بالا آیت شریفہ اور حدیث شریف کا مختصراً خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا تو ممکن ہے لیکن کسی آدمی کا اپنی فطرت سے ہٹنا ناممکن ہے۔ یعنی آدمی اپنی فطرت کے کاموں کو نہیں چھوڑ سکتا۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ کسی غیر مسلم کا اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونا، جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا یا پہلے سے کسی مسلمان شخص کا اپنے گناہوں کو اور بری عادتوں کو چھوڑنا، جیسے مشائخ تصوف نے اور موجودہ دعوت و تبلیغ نے لوگوں پر اثر دکھایا وہ مذہب یا وہ گناہوں کی عادت فطرت کے درجہ میں ہوتے ہیں جس کے بارے میں حدیث شریف میں بتایا ان کا چھوڑنا ناممکن ہے، لیکن اگر کوئی انہیں چھڑائے اور یہ انقلابی کام انجام دے تو سمجھو اس میں روحانی طاقت ہے اسی کو کرامت کہتے ہیں، کہ کرامت سے ہو سکتا ہے، لیکن یہ معنوی کرامت ہے، نہ کہ حسی۔

اور یہ (لوگوں میں دینی جان پیدا کر دینا) وہ طاقت ہے کہ اس کے مقابلہ میں بقول علمائے اسلام اہل اللہ کی کرامات بیچ ہیں۔ کیوں کہ وہ کرامت معنوی ہے اور یہ کرامت حسی ہے اور معنوی کا درجہ حسی پر بلند ہے۔ کیوں کہ حسی کرامت میں استدراج کا احتمال ہے اور معنوی میں یہ احتمال نہیں (کرامات شاہ امداد اللہ ص ۱۱۱ و ۱۱۲)۔

پوری بات کا خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے احوال سے معلوم ہوا کہ ان کے احوال دینیہ معنوی کرامت کے درجے میں ہیں، ان کی کرامت نہ سہی کام کی تو کرامت ہے! پھر ”ضلالت“ کیسی؟ علماء حضرات اس بات کو ہماری ناسمجھی یا مبالغہ و زیادتی سمجھنے سے پہلے کسی شخص کو پہچاننے کی بھی زحمت اٹھائیں، کیوں کہ جس طرح ہم نے یہ بات حضرت مولانا محمد

سعد صاحب کے بارے میں کہی ہے اسی طرح قرآن و حدیث کی روشنی میں مدارس و مکاتب کے علماء حضرات کے بارے میں بھی کہی ہے، کہ ان کی ۵۰/۴۰ سالہ تعلیمی خدمات کی طاقت بھی کرامت و معجزہ کی طاقت سے کم نہیں بشرطیں کہ وہ دینی تمام اصولوں کے مطابق خدمات انجام دیں، دیکھیے ہماری کتاب (نَجِّ الْأَمَّةَ فِي إِصْلَاحِ الْأَمَّةِ ۱۳۰۳) میں۔ الحمد للہ ہمارا مزاج دینی ہے، جو بات حق ہے وہی کہتے ہیں۔

حضرت مولانا سعد صاحب کی باتیں اپنے دادا حضرت جی مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی باتوں سے کم نہیں جن کے بارے میں شیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ان کے توکل علی اللہ کا یہ حال تھا کہ اگر ساری دنیا ان کے مخالف ہو جائے تو ان کے توکل علی اللہ میں کوئی فرق نہ پڑے اور وہ اپنی دعوت الی اللہ کو جاری رکھیں۔ (ہکذا)

(۳) کسی دوسرے کے کلام کو سمجھنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کلام کی مراد خود متکلم سے دریافت کی جائے۔ اگر متکلم سے پوچھے بغیر سامع خود ہی اس کی مراد متعین کرے تو اس میں خطا کا احتمال ضرور ہوگا۔ کیوں کہ تاویل تو شرح ان لوگوں کے اقوال کی کرتے ہیں جن سے براہ راست پوچھنے کی نوبت نہ آئی ہو ان کے انتقال کی وجہ سے، رہے زندہ لوگوں کے اقوال تو ان کی مراد خود انہی سے پوچھی جاتی ہے۔ ہم ذیل میں چند ایسے امور پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کسی کی مراد کو متعین کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

الف : فن کے بدلنے سے اصطلاحات کے معانی بدل جایا کرتے ہیں۔

ب : فقہ میں وجوب و جواز یا عدم جواز کے معنی ظاہر ہیں۔

ج : علم کلام میں جواز بمعنی ممکن و صحت اور وجوب بمعنی ثبوت ہے۔

د : نحو، صرف اور ادب میں جواز وجوب کے معنی، فقہ کے جواز وجوب کے معنی کا غیر ہوتے

ہیں۔

ھ : علم منطق میں کلمہ مقسم نہیں، بلکہ مفرد کی ایک قسم ہے جو مقترن بالزمان کو کہتے ہیں لیکن علم نحو میں یہی لفظ مقسم بن جاتا ہے۔

و : علم ادب میں لفظ قال الگ الگ محل کے لحاظ سے الگ الگ معانی مثلاً حکم دینا۔ سوال کرنا۔ جواب دینا۔ درخواست کرنا اور کوئی کام کرنا وغیرہ میں مستعمل ہوتا ہے۔

ز : ابھی فقہ کے دو الفاظ بتائے فرض و واجب وہ ہی محاورے میں اپنے معنی موضوع لہ سے ہٹ کر استعمال ہوتے ہیں مثلاً کوئی آقا اپنے غلام کو، باپ اپنے بیٹے کو کسی کام کے ضروری ہونے کو بتائے گا تو یہی لفظ استعمال کرے گا ”علیک ھذا“ ہم بولتے ہیں مدرس کو درس سے پہلے مطالعہ فرض ہے۔ تبلیغی احباب تحریض علی تہجد کے لیے بولتے ہیں ”ہم تبلیغی لوگوں کے لیے پانچ نمازیں نہیں چھ نمازیں فرض ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فقہی اصطلاحات بھی مواقع استعمال سے بدل جاتی ہیں یعنی اپنے معنی موضوع لہ پر قائم نہیں رہتیں چاہے الفاظ وہی ہوں۔ بلکہ خود فقہ میں بھی اپنے لفظ سے معنی موضوع لہ کا تحلف ”اخذا من الحدیث“ پایا جاتا ہے مثلاً غسل جمعہ میں وجوب کا معنی مختلف ہے۔

ح : کبھی لفظ ایک ہوتا ہے اور معنی بھی ایک لیکن وہ مستعمل ہوتا ہے دو متضاد صفات و ذوات پر۔ جیسے لفظ طائفہ۔ بڑے اہل اللہ پر مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی پر اور فاحشہ عورت پر۔ کتنا تضاد ہے!! قرآن کے الفاظ میں اس کی مثال : وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ آمَنُوا اور وَبَشِّرِ الْمُتَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ یہ تو دو شخصوں پر اطلاق تھا۔

ط : اس سے بڑا تعجب یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک ہی شخص پر دو متضاد معنی ”مدح و ذم“ پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً ایک سیلائی کرنے والا شخص (درزی) ایک آنکھ سے کانا ہے، اسے کسی نے اپنا قیمتی کپڑا سینے کے لیے دیا سینے کے بعد صاحب لباس کہتا ہے، کاش اس کی دوسری آنکھ بھی سالم ہوتی۔ اس کا ایک پہلو مدح کا ہے کہ جب ایک آنکھ ہوتے ہوئے اتنا اچھا سیاہ ہے اگر دوسری بھی

ہوتی تو کتنا اچھا سیتا اور دوسرا پہلو ذمہ کا ہے کہ اگر دوسری آنکھ ہوتی تو کپڑا نہ بگاڑتا۔

ی : ایک لفظ ایک معنی میں اپنی حقیقت کے ساتھ جب کسی پر بولا جائے تو وہ لفظ دوسرے لفظ کی اپنی حقیقت کے ساتھ بدل جائے اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔ جب کہ پہلا شخص کم رتبے کا اور دوسرا شخص بڑے رتبے کا ہو۔ مثلاً ”مُبَاحَاتُ الْعَوَامِ سَيِّئَاتُ الْأَبْرَارِ وَحَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ“ (نبراس ۴۵۲)۔ جس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ لوگوں کے دینی مرتبہ کی وجہ سے ”نفل نماز و ذکر خدا“ جو نیکی ہے برائی سے بدل جائے کیوں کہ بلند رتبہ کی نیکی تو اور بلند ہوتی ہے۔ معلوم ہوا فرق مدارج ایک مسلم حقیقت ہے۔

غور کی بات یہ ہے کہ شریعت ”فقہ“ میں مباح، سیئہ اور حسنہ کے مدلولات متعین ہیں، جو سیئہ ہے وہ حسنہ اور جو حسنہ ہے وہ سیئہ نہیں بن سکتی پھر بھی یہاں بن جاتی ہے جو بالکل خلاف شریعت ہے۔ جب کہ اس اصول کو بھی علماء حضرات درست مانتے ہیں، تو اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے بتایا کہ یہ لوگوں کے مختلف روتبوں کی وجہ سے ہے۔ پس پیش آمدہ دعوت کے مسئلہ میں ان سب کو ملحوظ رکھا جائے تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال میں کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

ہماری گہری سوچ تو ہمیں یہاں تک لیجاتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح و تربیت اور تہذیب میں بھی اصول بدلا کرتے ہیں مثلاً حکمرانوں کے، مشائخ تصوف کے، ادباء و مدرسین کے، والدین کے، مختلف اداروں اور تنظیموں کے اصول۔ ایک کے یہاں جو اصول تربیت ہے ضروری نہیں کہ دوسرے کے یہاں بھی وہ اصول ہو۔ اسی طرح برعکس۔ خلاصہ یہ کہ کسی کی بات کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے ان سب کا اور کتابوں میں مذکور اصول ان سب کا لحاظ ضروری ہے یہ بہ طور نمونہ پیش کیا ہے۔ کیوں کہ مخاطبین کون ہیں یعنی کس درجہ کے ہیں، خطاب کس میدان کا ہے، خطاب کس زمانہ کا ہے، خطاب صراحتہ مناسب ہے کہ کنایہ اور اشارہ میں، کلام کا کون سا جز قابل زور ہے، بات کس پس منظر میں کی جا رہی ہے، مذکورہ بات مقصود قائل ہے کہ مقصود کا واسطہ ہے،

کلام میں شرط وغیرہ مذکور ہے کہ محذوف، محذوف ہے تو مراد بھی ہے کہ نہیں ان سب ہی گوشوں پر دھیان دینا ہوتا ہے اور ضرب الامثال اور محاورے مزید براں۔

(۴) ہر مشن ہر تحریک والے کہ یہاں اپنے مشن اپنی تحریک کی اہمیت ایک مسلم اصول ہے، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کے یہاں اس کی اہمیت ہو یا نہ ہو۔ جب نفس تحریک کی اہمیت مسلم ہے (صغریٰ) تو اسے دوسری تحریکوں سے بلند ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرے گا (کبریٰ) جو معقول شی ہے نتیجہ یہ کہ وہ بلند ضرور ہوگی (بزعم خود)۔ اس سے ان لوگوں کی سوچ کا غلط ہونا واضح ہو گیا جو اس کی بیان کردہ اہمیت و بلندی کو اپنی یا دوسری تحریکوں کی مخالفت یا ٹکراؤ پر محمول کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا اصل مقصد اپنی تحریک کی اہمیت یا بلندی بتانا ہے جو ان کا جائز حق ہے، نہ مخالفت مقصود ہے نہ ٹکراؤ۔

حتیٰ کہ وہ اس اہمیت کے خاطر مبالغہ سے کام لے تو قرآن وحدیث اس سے ممانعت اس لیے نہیں کرتے کہ خود انہوں نے اسے استعمال کر کے نمونہ دیا ہے۔ باوجودیکہ وہ تحریک اس درجہ کی نہ ہو جو مبالغہ سے جتنائی جا رہی ہے کیوں کہ مبالغہ کہتے ہی اسے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک جائز اور درست عمل ہے۔ لہذا اہل تبلیغ کے بعض ایسے جملے جو تبلیغ کی اہمیت کے ہوں مثلاً تبلیغ کو لازم و فرض بتانا اور اسی کو اصلاح نفس کے لیے کافی بتانا وغیرہ اور جو مدارس یا خانقاہوں سے بظاہر ٹکراؤ پر دال ہیں انہیں اسی اصول سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر مقابلہ کی حقیقت سمجھ لی جائے تو کوئی خدشہ ہی باقی نہ رہے، کیوں کہ مقابلہ و مسابقت ہمیشہ اشخاص و اعمال میں مقصود ہوتا ہے مثلاً قراءت میں اور قراء حضرات میں مسابقت برخلاف قراء اور مقررین میں مسابقت اور مقابلہ کہ اس کو مقابلہ نہیں کہہ سکتے بس اس طرح دعوت و تبلیغ کا معاملہ خانقاہ و مدارس کے ساتھ مقابلہ ہے ہی نہیں پھر ٹکراؤ کا خیال کیسے؟

تنبیہ : بلکہ آپ اگر کم ظرف نہیں اور حق شناسی کا جوہر رکھتے اور تبلیغی دینی نتائج و ثمرات پر وسیع و تحقیقی نظر بھی رکھتے ہیں تو اس مبالغہ کو مبالغہ نہیں حقیقت پر بھی محمول کریں تو آپ کے وسیع ظرف اور حق شناسی کی دلیل ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے تبلیغ کی چند وجوہ ترجیح لکھی ہیں۔ اب اسی ضمن میں ہم آپ کو اشارہ کر دیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر کیے گئے ۷۰ اعتراضات میں اکثر یہی خطا ہوئی ہے۔ کیوں کہ حضرت موصوف کے اکثر اقوال میں وہ ہی مبالغہ۔ جائز حق۔ ہے پھر تو ان سارے اعتراضات کے جوابات کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ جو مبالغہ پر مبنی ہیں۔

(۵) پوری اسلامی تاریخ میں چاہے وہ دور خلافت ہو کہ دور امارت، دور محدثین ہو کہ دور فقہاء یا ان کے بعد اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی بھی تحریک نے پوری دنیا کو دینی اور مذہبی تمام امور کے لحاظ سے اس طرح مسحور کیا ہو جس طرح دعوت و تبلیغ کی اس مروجہ تحریک نے۔ ہاں حضرت عمرؓ کے دور میں اسلامی حدود وسیع ہوئیں، تاتاریوں کے یہاں زازان مسلم حکمران کی وجہ سے اسلامی نظریہ شاہی بن گیا تو اسلامی حدود وسیع ہوئیں اور بعض مشائخ تصوف کے دور میں کافی دینی فوائد حاصل ہوئے لیکن پھر بھی وہ ایک محدود فائدہ تھا عالم گیر نہیں تھا، عالم گیر سحر انگیزی کی مثال صرف تبلیغ ہی نے پیش کی ہے۔

اگر اس سحر انگیزی کے اسباب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ لوگوں میں دین کی حقیقت پیدا ہونا ہے، کیوں کہ حقیقت دین کے بغیر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا ناممکن ہے، اور حقیقت دین پیدا ہوتی ہے لوگوں کی قربانیوں سے اور قربانیاں پیدا ہوتی ہیں لوگوں کے اپنے اوقات اکثر و بیشتر مسجدوں میں گزارنے سے، جہاں ان کا شب و روز تعلیم و بیانات کے ذریعہ ایمانی و دعوتی ذہن بنتا اور بنایا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ عالمی سحر انگیزی انہی بیانات سے بچند واسطے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر

انہی بیانات کو مجروح کیا جائے تو نہ دعوت میں جان رہے گی نہ حقیقت دین پیدا ہوگی اور اتنی بڑی انقلابی تحریک قیودات غیر ضروریہ کی وجہ سے معطل ہو کر رہ جائے گی۔ سوچئے تو سہی صرف ایک شخص کا ایک ہی عمل یعنی ایک مقتدی باوجودیکہ وہ مکمل امام کے تابع ہے ذرا انحراف کی گنجائش نہیں لیکن پھر بھی اس کی سہوات سے درگزر کیا گیا ہے اور سجدہ لازم نہیں کیا گیا ہے اتنی چھوٹ تو اس کو بھی حاصل ہے اور یہ صرف ایک شخص کے ایک عمل میں ہے تو ایک انقلابی تحریک کو اتنا بھی درجہ حاصل نہ ہو!! اسے مکمل ایک امام کے تابع مقتدی کی طرح اور علاقے کے ادارے کے ایک مدرس کی طرح تابع و مقید تصور کرنا بھی ایک سبب ہے مسئلہ کے حل نہ ہونے کا

(۶) دعوت و تبلیغ کے بارے میں بھی گہری معرفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جسے ہم ایک بدیہی قاعدہ سے سمجھنا چاہتے ہیں اور بدیہی وہ ہوتا ہے جسے ہر عام و خاص سمجھے اور بلا دلیل یقین کرے۔ وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کے بارے میں علماء کی اور عوام کی بھی چند قسمیں ہیں۔ پہلی قسم: یہ کہ اس کام کو صرف ذہنی طور پر اچھا سمجھیں۔ چاہے ملفوظات پڑھ کر، تقاریر سن کر، دعوتی حیرت انگیز کارنامے کو دیکھ کر۔ لیکن عملی طور پر اسے انجام دینے کی نوبت نہ آئی ہو یا انجام دہی بدرجہ کالعدم ہو۔

دوسری قسم : یہ کہ عملی طور پر اختیار بھی کیا ہو لیکن صرف سطحی اور رواجی طور پر، حقیقی طور پر نہیں، یعنی نہ گہری فکر سے نہ اخلاص سے۔

تیسری قسم : گہری فکر اور کامل اخلاص سے اختیار کیا ہو لیکن اپنی سادہ فطرت کی وجہ سے دعوت کی حقیقت اور اس کی اصلیت کو وہ بھی پورے طور سے سمجھ نہ پائے ہوں۔ یہ تین قسمیں وہ ہیں جنہوں نے دعوت کی حقیقت کو پایا ہی نہیں جن کی تعداد شمار کی جائے تو تقریباً پوری دنیا کی دو ٹولٹ مقدار حاصل ہو۔ اب اگر کوئی مسئلہ دعوت کا لیں تو اکثریت کس کی ہوگی وہ آپ سمجھ لیں۔

چوتھی قسم : دعوت کو اس انداز سے سمجھیں ہوں جیسا اس کا تقاضہ ہے حتیٰ کہ اس کی حقیقت و اصلیت کو بھی پالیا ہو۔ اس آخری قسم میں جس طرح دعوت کے اکابر جنہیں مرکز کے اکابر کہا جاتا ہے اور کہا جاتا تھا وہ سب ہی داخل ہیں اس طرح دنیا بھر کے وہ اشخاص ”عوام و علماء“ بھی داخل ہیں جو اس صفت کے حامل ہوں۔

لیکن پھر اس آخری قسم کی بھی دو قسمیں ہیں، اس کو سمجھانے کے لئے عربی ادب کے ایک جملہ کا سہارا لیں گے وہ ہے ”مَشْرُوبٌ بِالشَّيْءِ“ جو کسی شے کے انتہائی ذوق پر دال ہے بلکہ فطرت ثانیہ پر دال ہے یعنی بعض انسانوں کے لیے کچھ کام ان کی فطرت کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ مثلاً خطابت و کتابت، نعت و قرأت، تصنیف و تالیف نظام و اہتمام، مناظرہ و مباحثہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ اسی طرح دنیوی امور میں جس کی وجہ سے وہ اپنے اپنے میدان میں ایسی ایسی باتیں بولتے لکھتے اور اپناتے ہیں جو ہزاروں انسانوں میں انہیں ممتاز کر دیتی ہیں۔ یہ اس فطری مزاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی وہ بدیہی قاعدہ ہے جس کا اشارہ ہم نے چند سطور پہلے کیا تھا۔ یہ اہل فطرت اپنے اپنے میدان میں بے مثال کارنامے انجام دیتے ہیں اور دنیا ان کے کارناموں کو تسلیم کر کے کھلے دل سے ”خوش آمدید“ کہہ کر ان کا استقبال کرتی ہے۔

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں فرق مدارج کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس بدیہی قاعدہ سے ثابت ہوتا ہے، اب اس کا احتمال تھا کہ اس فرق کو لوگ یا تو نا سمجھی سے یا نا انصافی یعنی خود غرضی سے اختیار نہ کریں اور حق والے کو حق نہ دیں تو حدیث شریف میں آگاہ کر دیا۔ ”أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَاذِرَهُمْ“ ان دونوں کے مجموعے سے اب ہم کہتے ہیں کہ چوتھی قسم میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب ”مَشْرُوبٌ بِالْدَعْوَةِ“ ہیں یہ پہلی قسم ہوئی اور باقی سب ”غیر مشروب بال دعوت“ یہ دوسری قسم ہوئی اور اگر ناراضگی ہو تو کہیں باقی سب بھی ”مَشْرُوبٌ بِالْدَعْوَةِ“ ہیں

لیکن ایک قسم وہ جس میں یہ صفت اتم درجہ کی ہو اور دوسری قسم وہ جن میں اتم درجہ کی نہ ہو ان میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب میں یہ صفت اتم درجہ کی ہے۔

اور دعویٰ مذکور کی دلیل ان سب کے سالہا سالوں سے کیے جا رہے اور سنے جا رہے بیانات اور ان کی فکریں ہیں۔ کیوں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بیانات میں ایمان و یقین اور دعوت ہی دعوت ہے اور دیگر حضرات میں دین و شریعت ہے۔ اور ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ دیکھئے صفحہ ۱۶۸ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مدارس کا عظیم مقصد تعلیم ہے اور خانقاہوں کا مقصد تزکیہ ہے اسی طرح دعوت و تبلیغ کا خاص مقصد دعوت ہے اب اگر دعوت کی جدوجہد میں دعوت ہی نہ رہے تو ایسا ہوا کہ ہیں تو مدارس لیکن ان میں تعلیم نہیں پھر طاقت کہاں سے حاصل ہوگی؟ جو حضرات فطرۃً اس قاعدہ پر ہیں وہ ان بیانات میں فرق بھی ضرور سمجھتے ہیں، چاہے اس قاعدہ کی کوئی تفصیل کرے یا نہ کرے اور جو علماء و عوام حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی جانب ہیں اس کی غالب وجہ ایک یہ بھی ہے۔

ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ بدیہی قاعدہ ہے جسے ہر میدان میں ہر کس و ناکس سمجھتا ہے تو یہاں بھی جو حضرات اس کو سمجھتے ہیں وہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ساتھ رہیں گے وہ کبھی بھی ان سے جدا نہیں ہوں گے حتیٰ کہ ان کے نزدیک تو حضرت مولانا کی یہی باتیں جو دوسروں کے نزدیک باعث اعتراض ہیں وہ ہی ان کے یہاں حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے نہ صرف بلند درجہ پر ہونے کی بلکہ حق پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم بھی یہاں اپنے ذوق کی بات کہتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب ان باتوں کو کہنے میں کوئی تکلف سے کام نہیں لے رہے ہیں بلکہ یہ باتیں تو ان کی زبان سے بلا تکلف نکل رہی ہیں کیوں کہ وہ مشروب ہیں یعنی باتیں خود مولانا کی زبان سے فطرۃً نکلنے کے لیے اس طرح مجبور و بے قرار ہیں جس طرح جادوگر سجدہ میں

گرنے پر مجبور ہو گئے جس کو قرآن نے مجہول کے صیغے سے تعبیر کر کے سمجھایا ہے۔

”وَالْقِيَّ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ“ اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ صداقت سامنے آنے کے بعد وہ اپنے پر قابو نہ رکھ سکیں اور ایمان لانے اور سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس قاعدہ کی اگر دوسری مثال خود لفظ ”شرب“ سے آپ چاہتے ہیں اور وہ بھی قرآن شریف ہی سے تو وہ بھی پیش خدمت ہے۔ ”وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ“، یا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ان باتوں کو حضرت مولانا سے کہلو رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ ”مشروب بالدعوت“ ہیں اور اتم درجہ میں ہیں۔ اس کو آپ چاہیں تو کہہ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کام کو کھولا ہے جیسا حضرت مولانا محمد الیاسؒ و محمد یوسفؒ پر کھولا تھا۔ بیٹا، باپ کے نقش قدم پر ہوتا اور اس کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ ”الْعِرْقُ دَنَسًا“۔

آپ کو شاید اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ جو ”مشروب بالدعوت“ ہو وہ اپنے بڑوں سے پائے ہوئے ورثہ کی نہ پوری طرح حفاظت کر سکتا ہے بلکہ اس کو زمانہ کے تقاضہ کے مطابق اگلی منزل پر بھی لے جاسکتا ہے جس کے لیے کچھ تجدیدی اقدام بھی ضروری ہوگا کیوں کہ اگلی منزل ایک تو دور بھی ہوتی ہے اور بلند بھی۔ اور دوری اور بلندی خود جدت ہے تو وہاں پہنچنے کے لیے بھی توجہ و جدت چاہیے۔ ہم اس پوری بات کی مثال دیتے ہیں تاکہ شرح صدر ہو جائے۔

مثال ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کہ وہ ”مشروب بالدين والشریعت“ تھے، ہمیشہ ان کو فکر لگی رہتی تھی شریعت و دین کی اور اسے اگلی منزل پر لیجانے کی تو پیش آمدہ مسئلہ میں وہ دین و شریعت کو سوچتے رہتے جس سے وہ دین و شریعت کو درست طور پر پالیتے جس کی وجہ سے وہ جو سوچتے وہی حکم بذریعہ وحی نازل ہوتا۔ چون کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مزاج معلوم

تھا تو ان کی سوچ کے مطابق حکم نازل فرماتے جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے ”إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ“ (ترمذی ۲۰۹۲)۔ علماء جانتے ہیں موافقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ۱۷/۱۸ ہیں۔ اور شاید فرمان نبوی ”لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ..“ (ترمذی ۲۰۹۲) کی وجہ یہی ”مشروب بالدين“ ہے۔ اب تو سمجھ لیا ہوگا کہ جو جس کا مشروب ہوتا ہے وہ اس پر کھلتا ہے وہ کسی اور پر نہیں کھلتا۔

تو پھر یہ بھی کہنا بجا ہوگا کہ غیر مشروب بالدعوت چاہے جو کوئی ہو اور جتنے بھی ہوں اگر ان کے ساتھ مشروب بالدعوت نہ ہو تو ترقی تو درکنار حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ، و مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے پایا ہوا ورثہ بھی محفوظ نہ رکھے سکیں نتیجہ یہ ہو کہ یا تو دعوت و تبلیغ ختم ہی ہو جائے یا رہے لیکن بے جان و بے روح ہو کر یا رسمیت و خود غرضی میں ڈھل کر۔ آپ چھوٹے بڑے دینی ادارے اور مکاتب قرآنیہ کے منتظمین میں ترقی یا جمود یا انحطاط جو بھی پائیں گے اس کی وجہ اس مذکورہ وصف کی زیادتی یا کمی یا اس کا فقدان پائیں گے ہماری اس بات پر غور فرمائیں کتنی درست یا نا درست ہے! بس اس تفصیل نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو ”أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَاذِرَ لَهُمْ“ کے حقیقی مرتبہ پر کھڑا کر دیا اور آپ نے بھی شاید دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

(۷) ہمیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں مثلاً ہندی، اردو، انگریزی اور گجراتی وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں ان زبانوں میں نہ صرف یہ علوم پائے جاتے ہیں بلکہ لوگ بلا پڑھے عرف و محاورے کی وجہ سے ان کا گاہے گاہے استعمال بھی کرتے ہیں، ان کی بولیوں میں ان کا رنگ و ڈھنگ پایا جاتا ہے اور اصحاب ذوق اس کا لطف بھی اٹھاتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہمیں آپ بھی اس کا تجربہ کیجیے۔

ان علوم سے مراد وہ بحثیں ہیں جو بلاغت، اصول، تفسیر، اصول فقہ، اصول حدیث اور نحو وغیرہ میں ہیں۔ مثلاً نحو میں شرط و جزاء، حذف و ذکر، افعال قلوب، مقاربہ اور مدح و ذم۔ اور اصول فقہ میں امر و نہی کی اقسام، امر و نہی کا طلب فعل یا ترک فعل کی طلب کے لیے ہونا، حقیقت و مجاز۔۔۔ اور اصول تفسیر میں فہم مخاطب کی رعایت، کلام بطریق تخصیص و کنایہ، تذکیر بشیر و تہدید اور حاضر و غائب۔۔۔ اسی طرح بلاغت میں اسناد، استعارہ، تشبیہ، مبالغہ، کنایہ، مخاطب کے درجات، تاکید مدح بالذم اور عکس اور تخیلات و توہمات وغیرہ۔۔۔ اور اصول حدیث میں جرح و تعدیل اور ان کا مسیئ و مبہم ہونا وغیرہ۔

ان کا اجراء اپنے اپنے انداز میں لوگوں کے مختلف طبقات میں مثلاً عورتوں، جوانوں، بوڑھوں میں پھر بازاروں، مختلف اداروں کے عملہ میں اور میلوں اور جلسوں میں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس تفصیل سے ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ جب ایک عام آدمی کے کلام کا حال یہ ہے تو کسی اسٹیج کے خطیب و مقرر کے بیانات میں ان کی جھلک فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ لہذا کسی خطیب کے کلام سے کوئی بات ایسی سامنے آئے جس سے اس کے ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی اعتراض ہو تو مذکورہ کلام کے اصولوں پر ڈھال کر اس کی مراد کو متعین کرنا چاہیے جس سے وہ اعتراض دفع ہو جائے۔ یہ بات اس وقت پتھر کی لکیر ہو جب کوئی تقریر کی طرح یہ حال تحریر کا بھی ثابت کر دے۔

تو آئیے ہم تقریر و بیان کی طرح تحریر کا بھی یہی حال بتاتے ہیں، تحریر کا فن اپنی ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے بلکہ بعض چیزیں تو اس کی انتہائی اہم ہیں مثلاً تصحیف وغیرہ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ قادر الکلام شعراء کی ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے ان کی قدر و منزلت نقد و زر سے کم نہیں، وہ اگر کسی سے خوش ہو تو اسے آسمان تک اٹھالیا جائے ورنہ تحت اثری دفن کر دے۔ ایک شاعر کو اپنے بادشاہ سے شکایت تھی وہ اس سے ناراض تھا تو اس کی ہجو (ذم) میں ایک بیت تیار کی۔ شعر

لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِي عَلَى بَابِكُمْ كَمَا ضَاعَ عَقْدٌ عَلَى خَالِصَةٍ

خالصہ اس بادشاہ کی بیوی تھی، ترجمہ : میرا شعر تمہارے دروازہ پر اسی طرح ضائع ہو گیا، جس طرح قیمتی ہار خالصہ کے گردن میں (اس کی بد صورتی کی وجہ سے) ضائع ہو گیا۔ اس سے بادشاہ اور اس کی بیوی دونوں کی ہجو کی ہے۔ جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سزا دینے کے لیے اسے طلب کیا، شاعر سمجھ گیا کہ بادشاہ کو ہجو کی خبر ہو چلی ہے، بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے ہماری ہجو کی ہے؟ شاعر نے کہا نہیں تو کہا کہ تو اس نے وہی شعر دوبارہ پڑھا لیکن ”ضاع“ عین کے شوشے کو کاٹ کر ”ء“ پڑھا ”ضاء“ جس کے معنی ہیں روشن ہونا۔ اب بادشاہ اور اس کی بیوی کی مدح اور ثنا ہو گئی۔ اور بادشاہ نے انعام دیا۔ دیکھیے صرف تھوڑے سے شوشے سے کتنا فرق ہو گیا جب صرف اتنے فرق سے مدح و ذم یا انعام و سزا کا فرق ہو سکتا ہے تو پورے کلمہ اور پورے جملے سے کتنا فرق ہو سکتا ہے سوچنے کی چیز ہے۔ فند بر۔ تو کسی کے کلام کی اچھی مراد بتانے میں ان اصولوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

(۸) حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات میں لوگوں کے مراتب سمجھنے میں عام سوچ کے خلاف لکھا ہے کہ بہت سے اخلاف اسلاف سے، تلامذہ اساتذہ سے، مریدین مشائخ سے اور غلام اپنے آقاؤں سے علم و معرفت اور زہد و تقویٰ میں سبقت و فوقیت لے گئے ہیں، بہت سے آزاد کردہ غلام محدثین ہیں، حتیٰ کہ صحابیت کے درجہ کو چھوڑ کر بہت سے تابعین بھی بعض صحابہ سے مذکورہ چیزوں میں فوقیت لے گئے ہیں۔

چنانچہ اس اصول کی تائید جوامع الکلم کی ایک حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہے ”رَبُّ مُبَلِّغٍ أَوْعَىٰ لَهٗ مِنْ سَامِعٍ“ کہ ایسا بھی ہوتا ہے جسے علم پہنچایا جاتا ہے وہ اس علم کو زیادہ محفوظ رکھتا ہے یعنی سمجھتا ہے سامع اول سے یعنی پہنچانے والے استاذ سے (مشکوٰۃ ۳۵)

یہ ہم نے خلاصہ بیان کیا ہے۔ ان کے الفاظ حدیث شریف کے اس ٹکڑے

”لَمْ يُنْصَرِعْ بِهِ نَسْبُهُ“ کے ماتحت یہ ہیں ”إِنَّ أَكْثَرَ عُلَمَاءِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ لَا أَنْسَابَ لَهُمْ يَتَفَخَّارُونَ بِهَا بَلْ كَثِيرٌ مِنْ عُلَمَاءِ السَّلَفِ مَوَالٍ وَمَعَ ذَلِكَ هُمْ سَادَاتُ الْأُمَّةِ وَيَتَابِعُ الرَّحْمَةِ“۔ (مرقات ۲/۲۲۱) اس سے عام سوچ کی تردید ہوگئی اور اس سمجھ کی خطا واضح ہوگئی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تو چھوٹے ہیں اور دیگر اکابرین بڑے اور قدیم ہیں بلکہ بعض تو کہتے ہیں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دیولا کے شاگرد ہیں پھر ان کے مقابلے میں شاگرد کی بات کیسے درست ہے۔ غور کریں کہ آج جس میدان میں جو کوئی بڑے رتبے پر ہے وہ اپنے پیر اپنے استاذ سے ایسا بلند ہے کہ لوگ انہیں ان کے پیر سے زیادہ جانتے ہیں اسی طرح ان کے اساتذہ سے۔ معلوم ہوا حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ معاملہ بالکل درست ہے۔

(۹) ہر بڑے آدمی کو اپنے مختلف تجربات و اقدامات اور خیالات میں اس بات کا تجربہ حاصل ہے کہ اس کے کتنے ہی تجربات و اقدامات غلط تھے جنہیں وہ درست سمجھتا تھا اور وہ اس پر قائم تھا لیکن بعد میں خود اس کے ہی دوسرے تجربہ نے اس کو غلط قرار دیا۔ گویا یہ بھی ایک بدیہی کلیہ ہے۔ جسے یہاں اس مسئلہ میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(۱۰) یہ کلیہ بھی ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ جس طرح کسی بندہ خدا کی رعایت میں کتاب و سنت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کتاب و سنت کی رعایت میں بھی کسی بندہ خدا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں میں توازن اور راہ اعتدال اختیار کرنا خاص اہل علم و بصیرت والوں کا کام ہے۔ آخرت کے پل صراط پر سے گزرنے سے پہلے دنیا کے اس پل صراط پر سے گزرنا آسان نہیں۔ ورنہ خود کے ایمان کے لالے پڑ جائیں۔ کیوں کہ توازن کی رعایت کے لیے گہرے علم و حکمت کی اور احتیاط و تہیظ کی ضرورت ہوگی۔ غالباً امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہاں مفید ہوگا ”اگر کسی میں ۹۹ وجوہ کفر کی ہو اور صرف ایک وجہ ایمان کی ہو تو اسی ایمان کی وجہ ملحوظ رکھی جائے گی۔“

(۱۱) ان ہی مذکورہ اصول و امور کی روشنی میں ہم دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کو از روئے فتویٰ اسی طرح درست سمجھتے ہیں جس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے ان اقوال کو درست سمجھتے ہیں، نہ فتویٰ کا انکار کرتے ہیں نہ اس کی مخالفت و تغلیط جیسا کہ ہم نے بندہ کی سادہ سمجھ میں لکھا ہے اور نہ مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کو غلط سمجھتے ہیں۔ رہا سوال کہ دونوں (متضاد) کس طرح درست ہو سکتے ہیں؟ جواب: اس کی وضاحت جوابات کے ذیل میں ہوگی۔ اگر ان مذکورہ امور و اصول اور دیگر ان اصول کو جو کتابوں میں مذکور ہیں ملحوظ رکھا جائے تو دونوں کو درست کہا جاسکتا ہے۔ ایک باشعور مدرس پوری زندگی میں شب و روز یہی تو کرتب دکھاتا ہے پھر یہاں کیا پریشانی ہے۔ البتہ اتنی بات یہاں واضح ہو جائے کہ فتویٰ کا مدار استفتاء پر ہوتا ہے ”جیسی روح ویسا فرشتہ“ اگر مستفتی غلطی یا خیانت کرے تو فتویٰ بھی اسی پر متضمن ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو تو وہ معذور ہوتا ہے اور گیا ہو پھر بھی سکوت اختیار کرے تو وہ ماخوذ ہوتا ہے۔

(۱۲) ان اصولوں کے باوجود جو شخص پہلے سے ہی نظریاتی لحاظ سے کسی تحریک و عمل سے مثلاً دعوت و تبلیغ سے متفق نہ ہو، یا متفق ہو لیکن اس نزاعی مسئلہ میں اپنی ہی سمجھ اپنی ہی بات کو حرف آخر سمجھتا ہو باوجودیکہ متنبہ کیا گیا ہے۔ ”وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ“ و باوجودیکہ حق سامنے آگیا ہے اسے سمجھانے کی کوئی راہ نہ ہمارے پاس ہے اور نہ کسی کے پاس، پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ واللہ الموفق۔

مذہب اسلام کی جامعیت و کمالیت

دین اسلام، دیگر مذاہب کے عقلاء و مذہبی راہنماؤں کے وضع کردہ یا سماوی مذہب میں تصحیف کردہ مذہب کی طرح نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تحریف و تصحیف سے سالم سماوی مذہب ہے۔

وہ نہ صرف سماوی مذہب ہے بلکہ وہ تمام کمالات و خوبیوں کا گلدستہ اور ان کا اس طرح جامع ہے جس طرح بحر محیط اپنی چاروں طرف بہنے والی نہروں کو اپنے اندر جذب کرنے میں۔ پھر وہ جامع ہونے کے ساتھ نہ صرف کامل ہے، جس سے ناقصین درجہ کمال حاصل کر کے کاملین بنتے ہیں۔ بلکہ وہ مکمل بھی ہے۔ جس سے کاملین اگلی منزل پر قدم رکھ کر دوسروں کو کامل بنانے کا سہرا باندھ کر وہ مکملین بنتے ہیں۔ علامہ طبیبی شافعیؒ نے اس پر بڑی نفیسبحاث احادیث مبارکہ کی تشریحات میں فرمائی ہیں۔ (طبیبی)

مختصر یہ کہ وہ دین و مذہب جس کی وسعت کرۂ ارض کی وسعت سے کہیں زیادہ ہے، اس دین و مذہب نامی شخص نے نہ اپنا کوئی قدم بلا علم و بلا دلیل اٹھایا نہ اس نے اپنا کوئی قدم بلا حکمت بلا بصیرت کرۂ ارض کے کسی حصہ پر رکھا۔ اس دین و اسلام نامی شخص سے نکلنے والا ہر ہر قول اور ایک ایک عمل نہ صرف علمی دلیلوں پر مشتمل ہے بلکہ حکماء کی ہزاروں حکمتوں اور بصراء کی لاکھوں بصیرتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بھی ہے۔

بھلا جس دین و مذہب کا یہ حال ہو اس میں کسی پر ظلم و تشدد کا تصور کیسے ممکن ہے! میں سمجھتا ہوں وہ نہ صرف ایک معصیت ہے خدا سے بغاوت ہے بلکہ ایک گناہ اور دین سے انحراف بھی ہے، جسے نہ وہ دین نامی نفیس مزاج لطیف طبیعت شخص برداشت کر سکتا ہے، نہ اس کے کاملین و مکملین عشاق گوارہ کر سکتے ہیں۔ جب اس کا یہ حال ہے تو عقل صرف کیجیے اور سوچیے کہ اس کے اصولوں کی وہ دنیا کیسی ہوگی!! جن اصولوں پر اس کی بنا منحصر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں موجود تمام ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کا ہار بھی بنا کر ان اصولوں کو پہنایا جائے تو اس کے ایک اصول کی بھی قیمت نہ چکے!

ہم یہاں ان ہی اصولوں میں سے موقع کے مناسب صرف ایک اصول کو پیش کرنا

چاہتے ہیں تاکہ پیش آمدہ مسئلہ پر مناسب روشنی ڈالی جاسکے جسے آپ ذیل کے عنوان سے سمجھ لیں گے یہی اصول ہماری یہاں غایت ہے اور اس کی جو قیمت بنے لوگ اس کی وہ قیمت چکائیں یہی ہماری چاہت ہے۔ آپ اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

اصول جرح و تعدیل فی الروایہ

علماء حضرات بخوبی واقف ہیں کہ حدیث شریف کی صیانت و حفاظت کے خاطر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے چند اصول مرتب کیے ہیں جس سے رجال حدیث یعنی روایت کو از روئے ثقہ و غیر ثقہ پر کھا جاتا ہے، پرکھ کے بعد جس راوی پر کسی امام جرح و تعدیل نے توثیق کی ہو تو اس کی روایت معتبر و مقبول شمار ہوتی ہے ورنہ غیر معتبر اور نامقبول۔

یہاں قابل ذکر اور قارئین کے لیے قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح راوی کے معتبر ہونے کے لیے ضروری یہ ہے کہ اس کے پاس کسی امام جرح و تعدیل کی جانب سے ”تعدیل و توثیق“ کی سند ہو، اس طرح ہمارا دین یا کہیے ہمارا فن حدیث اس جرح و تعدیل کرنے والے امام و محدث کو بھی ”اصول“ کا پابند بناتا ہے، اور یہ رہنمائی لوگوں کو دیتا ہے کہ کس محدث اور کس امام کی جرح معتبر ہے اور کس امام کی جرح معتبر نہیں۔ سبحان اللہ کیا شان ہے اسلام کی!! تاکہ کسی پر ظلم و تشدد نہ ہو۔ بس انہی اصولوں یعنی شرائط کا ذکر ذیل میں ہے۔

امام میں جرح و تعدیل کی شرائط

پہلی شرط : یہ ہے کہ وہ امام اسباب جرح و تعدیل کو جاننے والا ہو۔ لہذا اگر ان کے اسباب

کو نہ جانتا ہو تو اس کی جرح یا توثیق غیر معتبر ہوگی۔ ”تَقْبِلُ التَّزْكِيَةُ مِنْ عَارِفٍ بِأَسْبَابِهَا“

(نزهۃ النظر ۱۱۶)

دوسری شرط : یہ ہے کہ وہ عادل وثقہ بھی ہو۔ لہذا غیر ثقہ کی جرح وثیق بھی غیر معتبر ہوگی۔
 ”إِلَّا مِنْ عَدْلٍ“ (نزہۃ النظر ۱۱۷)۔
 تیسری شرط : یہ ہے کہ وہ بیدار مغز ہو۔ متیقظ ہو۔ لہذا غیر متیقظ کی جرح معتبر نہ ہوگی۔
 ”مِنْ عَدْلٍ مُتَّقِظٍ“ (نزہۃ النظر ۱۱۷)۔

یہ آخری شرط بہت ہی اہم ہے۔ اس لیے کہ ہر شعبہ کا آدمی اپنا کام تو انجام دیتا ہے لیکن بسا اوقات وہ متیقظ سے انجام نہیں دیتا جس سے لوگ اس شعبہ کی اعلیٰ مسند کی طرف نظر کرتے ہوئے اعتماد کر لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ظلم کے شکار ہو جاتے ہیں اس لیے کسی پر جرح کرنے والے کے لیے اس شرط کا لحاظ نہایت ضروری ہوگا اور اس اصول کو اس کی جو قیمت امانت داری اور عدل و حق کی بنے وہ چکانی ہوگی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان شرائط کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مشہور قاعدہ ”وَبُضْهَاتُ تَبْدِئِ الْأَشْيَاءِ“ کی رعایت کرتے ہوئے ان کی اضداد کو بھی تفریعا بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اگر متیقظ سے جرح نہ کی ہو تو سہل کی ہو تو وہ معتبر نہیں پس راوی مجروح نہ ہوگا۔ پھر انہوں نے ان شرائط کی تائید و اہمیت میں اس فن میں کامل دسترس رکھنے والے امام، امام ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو اور امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کے عمل کو بھی بیان کیا ہے آپ حوالے سے مراجعت فرمائیں۔

الخصر ہمیں یہاں جو آپ کی توجہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ تساہل برت کر جرح و تعدیل کرنے والے امام کے جو دو حال بیان کیے ہیں وہ آپ کو سمجھانے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ امام عدم تیقظ سے کسی ضعیف راوی کی وثیق کر دے گا تو وہ اس حدیث کا مصداق بن جائے گا جو مسلم شریف کے مقدمے میں ہے کہ ”جو شخص کسی حدیث کو جھوٹا اعتقاد و خیال کرے پھر بھی وہ اسے

دوسروں سے بیان کرے تو وہ خود ایک جھوٹا شخص ہے۔ دوسرا اگر وہ امام ثقہ راوی کی تضعیف کر دے (چوں کہ اس سے وہ راوی اس جرح سے تادم حیات عیب دار بن گیا باوجودیکہ وہ ثقہ ہے) تو وہ امام اس راوی پر تہمت لگانے والا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ وہ امام خود یا تو شریعت کی نظر میں جھوٹا بن جاتا ہے یا تہمت لگانے والا۔ العیاذ باللہ۔ (نزہۃ النظر ۱۱۸)۔ یہ ہے غفلت سے جرح کرنے کا انجام جسے کہیں لینے کے دینے پڑ گئے۔ علماء حضرات تو ان شرعی نزاکتوں کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ الحمد للہ۔ اس پر عمل بھی فرماتے ہیں۔ لیکن جو عوام حضرات ایک دوسرے پر اور ان کے علماء حضرات پر جرح و نقد کرتے ہیں کیا انہیں ان اصول سے ذرہ بھی واقفیت ہے! مذکورہ شرط ”تبیقظ“ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر اہم ہے! کہ اسے ”شیخ اور طالب کے آداب“ کے تحت بھی بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”مجلس الملاء“ میں تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کوئی محدث اپنی اصل کا املاء کر رہا ہو اور مجمع کثیر کی وجہ سے آواز طالبین تک نہ پہنچتی ہو تو آواز پہنچانے والا مقرر کرے لیکن وہ عام آدمی نہ ہو بلکہ وہ بھی متیقظ ہو ”مُسْتَمِلٌ يَقْظُ“ یہاں بھی اس کی شرط ہے۔ (نزہۃ النظر ۱۲۶)۔

جرح میں اسباب تساہل

سوال یہ رہتا تھا کہ کسی امام نے کسی پر عدم تیقظ یعنی تساہل میں جرح یا وثیق کی ہے یہ کیسے معلوم ہو؟ تو قربان جائے علماء محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ پر کہ انہوں نے ہم کو باخبر ہونے کے لیے اس کے اسباب بھی بیان کر دیے اور ہمیں پتہ دے گئے کہ اگر کسی کی کسی پر جرح درست یا نادرست معلوم کرنا ہو تو اس امام کے اندر ان اسباب کو دریافت کرو اور پھر تم خود ہی اس کی جرح کا فیصلہ کرو کہ کس حد تک صحیح ہے؟ کیوں کہ اسباب وہ ہوتے ہیں جو ہر کسی کی زندگی سے جھلکتے چھلکتے ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔ جس سے اس امام کو ہم سمجھ سکیں۔ ذیل میں ان ہی اسباب کا بیان ہے۔

پہلا سبب: خواہش نفس کی پیروی۔ مثلاً مذہبی عصبیت کی وجہ سے ”وَالْأَفْئَةُ تَدْخُلُ فِي هَذَا تَارَةً مِنَ الْهَوَىٰ“۔

دوسرا سبب: غرضِ فاسد۔ ”هُوَ الْغَرَضُ الْفَاسِدُ“ (نزہۃ النظر ۱۱۸)۔ مثلاً لوگوں کو دوسروں سے دور کر کے اپنی طرف مائل کرنا۔ لکھا ہے کہ متقدمین میں ورع و تدین کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اس سے اکثر صحیح سالم تھے۔ لیکن متاخرین کا حال دیگر ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ علامہ تقی الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کچھ اور بھی اسباب بیان کیے ہیں مثلاً۔

تیسرا سبب: اصحاب تصوف و اصحاب علوم ظاہرہ (علوم حقہ وغیر حقہ) کا اختلاف اور ان کا تنافر۔ ”الْاِخْتِلَافُ بَيْنَ الْمُتَصَوِّفَةِ وَاصْحَابِ الْعُلُومِ الظَّاهِرَةِ فَوَقَعَ تَنَافُرٌ“ (شرح، نزہۃ النظر ۲۳۹)۔

چوتھا سبب: ورع و تقویٰ کے فقدان سے مذمت پر اتر آنا ”الْاِخْذُ بِالذِّمِّ مَعَ عَدَمِ الْوَرَعِ“ (حوالہ بالا)۔

دیکھیے یہ اصول اس لیے بہ طور ہدایت پیش کیے گئے ہیں کہ تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ اس طرح کے اعمال محدثین اور بڑے علماء سے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ جب کہ یہ کئی صدیوں پہلے کا حال ہے، پھر آج کا حال کس قدر قابلِ قال اور لائقِ فال ہو سکتا ہے وہ ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے علم میں رکھنے کی خاص وجہ یہ کہ ہم خود بلا کسی مسند جرح و نقد کا کام ہرگز انجام نہ دیں۔ ہم ان اعتراضات کے اوراق مرتب کرنے والوں سے مخاطب ہیں جنہوں نے غلط فہمی عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

نہایت توجہ کے قابل مقام

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد اب ہمیں اہم منزل پر قدم رکھنا ہے، سمجھیے اس سے پہلے کے

سارے ہی مباحث اس کی تمہید تھے۔ غور و توجہ کی منزل یہ ہے کہ محدثین کی ذکر کردہ تفصیل تو راوی کے صرف ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے متعلق تھی جس سے وہ راوی یا تو نقل روایت کا اہل یا نااہل ٹھہرتا ہے۔ اور یہ چیز یعنی حدیث شریف یا اس کی روایت، دین کا ایک جز ہے، جب اسلام نے دین کے ایک جز کے لیے اتنی احتیاط بتائی اور اس قدر اصول فراہم کیے ہیں تو کسی شخص پر کل دین کے بارے میں یعنی اس کے حق و باطل پر یا حق و ضلالت پر ہونے کے فیصلے کے لیے کس قدر اصول دیے ہوں گے یہ سوچا !! اور کیا یہ دل چسپ بات نہیں کہ کسی پر حق و ضلالت کا فیصلہ لینے کے لیے اس قدر احتیاط و تقیظ کی ضرورت ہوگی کہ دم گھٹنے لگے۔ اب ان دونوں مسئلوں کا تقابل کر کے اس کی اہمیت کو آپ اگر سمجھیں تو آپ متیقظ ہو سکتے ہیں۔ تو آئیے ہم اس پر مختصر روشنی ڈال دیتے ہیں۔

منبع حق ”قرآن“ کا فیصلہ فیصلہ حق کے لیے

گذشتہ تفصیل تو اصول حدیث کی تھی، اب ہم اپنے اصل اور اہم مرجع ”قرآن حکیم“ کی طرف مراجعت کر کے اس سے دریافت کرتے ہیں کہ اے خدا کی کتاب تو بتا کہ کسی پر حق و ضلالت کا فیصلہ لینے کے لیے کیا اوصاف ضروری ہیں اور اس کے کیا اصول ہیں؟ چنانچہ تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ہم صرف اس کی ۴ آیات قرآنیہ لیتے ہیں۔

(۱) وَإِذَا حُكِمْتُمْ بَيْنَ الْعَاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (سورہ نساء ۸)

(۲) يٰۤاٰدُوۤا۟ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاَحْكُمۡ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورہ ص ۲۶)

(۳) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورہ حدید ۲۵)۔

(۴) إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (سورہ نحل ۹۰)

ان میں سے پہلی آیت شریفہ کا خلاصہ ہے کہ ہمیں حکم ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کریں۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو خواہشات کی پیروی سے پوری طرح بچ کر نہیں تو (تم خود ہی) حق سے ہٹ جا کرو گے۔ تیسری کا حاصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ کی تنزیل کا سارا نظام ہی عدل و انصاف کے قیام کے لیے ہوا ہے تو پھر ہر چھوٹی بڑی بات میں اس کا لحاظ رکھو اور چوتھی کا حاصل ہے کہ خود اللہ تعالیٰ امر ہیں کہ عدل کرو (جس طرح اقیمو الصلوٰۃ میں امر ہیں)۔۔۔۔۔

ان میں سے دو میں عدل کا اور ایک میں حق کا اور ایک میں قسط کا ذکر ہے۔ اس میں کون سی چیز ایسی ہے جسے نظر انداز کیا جاسکے! صرف عدل کو دیکھیے، اگر عدل کی جامعیت کی طرف نظر کرتے ہوئے اسے تحریر کرنے جائیں تو وہ ایک کتابچہ بن جائے۔ تفصیل سے کنارہ کرتے ہوئے صرف توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ عدل کے ۳ درجات ہیں (۱) خدا کے ساتھ (۲) لوگوں کے ساتھ (۳) خود اپنے ساتھ تینوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرنا۔ ان تینوں کو ملحوظ رکھنے کو عدل کہتے ہیں جس میں سب ہی کچھ سما جاتا ہے۔

اور آیت خطبہ ثانیہ میں ۳ صفات ”عدل، احسان اور ایثار“ کا ۳ خرابیوں ”فحشاء، منکر اور بغی“ سے تقابل ہے جو ان کا توڑ ہے۔ اس طرح کہ

عقل کے تین درجات ہیں۔ (جزبرہ۔ سفاہت، حکمت)

شہوت کے تین درجات ہیں۔ (فجور، جمود، عفت)

غضب کے تین درجات ہیں۔ (تہور، جبن، شجاعت)

اور یہی تین برائیاں تمام گناہوں کی جڑ ہیں جن سے نواقسام حاصل ہوتی ہیں۔ جن میں افراط کی تین، تفریط کی تین اور اعتدال کی تین صلاحیتیں ہیں۔ ان تینوں کے توڑ کے لیے عدل کو لایا گیا ہے۔ کیوں کہ نواقسام کا مجموعہ مرکب ۳ صفات یا ۳ صلاحیتیں ہیں حکمت، عفت اور شجاعت پھر ان کے مجموعہ سے عدل و عدالت بنتا ہے۔ (نہج الاممہ فی اصلاح الاممہ حصہ ۴ ص ۳۳ از فیض ابرار ۶/۴ اور از مفتاح الغیب امام رازی)۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ جس عدل و حق کے ساتھ فیصلہ لینے کا حکم ہے وہ کس قدر جامع شریعت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمیں جو بھی کسی پر کوئی فیصلہ لینا ہو تو خواہشات سے اوپر اٹھ کر خالص عدل و حق کی روشنی میں فیصلہ لینا ہوگا ورنہ بہتر ہے معاملہ سے کنارہ کر لینا (واللہ اعلم) یہ ہے اسلام کی وہ جامعیت و کمالیت جو اپنے عنوان سے یہاں تک امتد ہے۔

اب قرآنی ان اصولوں یا ہدایات کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہے کہ کون کس کے حق میں کیا فیصلہ لیتا ہے۔ ہم کسی کا نام لینا نہیں چاہتے، کیوں کہ کسی کو مجروح کرنا پوری مدت عمر میں کسی دن بھی یہ کام نہیں کیا جسے ہم پورے تیقظ و امانت داری سے کہتے ہیں پھر اب اور آج کیوں؟ مقصد صرف پیش آمدہ مسئلہ کا شرعی صحیح تجزیہ ہے، نام سے فائدہ کچھ نہیں الٹا نقصان ہوتا ہے، نیز مسئلہ معروف و معرفت کی حد سے بھی تجاوز کر گیا ہے لہذا اس میں ابہام بمنزلہ بیان کے ہے۔ بس دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پہلے ہمارے اپنے دین و ایمان کی حفاظت فرمائیں پھر پوری امت کے دین و ایمان کی۔ آمین۔

امیر و شوریٰ کی شرعی حیثیت

امیر و شوریٰ ”امارت و شورائی نظام“ کا مسئلہ نہ صرف فقہی مسئلہ ہے بلکہ فقہ سے بڑھ کر ایک اعتقادی مسئلہ ہے اور بہت ہی نازک ہونے کے ساتھ اہمیت کا حامل بھی ہے، اور آج قیل و قال

کا زیادہ مداراسی پر ہے اس لیے ہم اس کی بغد ضرورت تفصیل پیش کرتے ہیں۔ ”واللہ الموفق“۔

آنے والی تفصیل سے پہلے خلاصہ کے طور پر ہم بتا دیتے ہیں کہ اسلام میں ”نظام امارت“ کے سوا کسی نظام کا نہ تصور ہے نہ کوئی حل ”آپشن“ بس امارت ہی کا نظام ہے۔ یہ اتنا ظاہر و باہر مسئلہ ہے کہ بڑے علماء حضرات کے اعتبار سے تو اسے دلائل سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں لیکن علماء کی ایک بڑی تعداد اس اعتقادی مسئلہ میں اپنے گھونسلے کی بنیاد کمزور شاخ پر رکھے ہوئے ہے اس لیے کچھ شرح و بسط سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں شاید حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل سے دھوکہ ہوا ہے چاہے خطاً یا قصداً تو ہم اس دھوکہ اور شبہ کو بھی دور کرنے کے دلائل پیش کریں گے۔ پہلے اس اعتقادی مسئلہ کی تفصیل اور اس کے دلائل۔

شرعاً امیر کا ہونا واجب ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے

مسلمانوں کے لیے ایک امیر و حاکم کا ہونا اتنا اہم ہے کہ علماء متکلمین اس کو واجب فرماتے ہیں، بلکہ اس پر ”اہل السنہ والجماعہ“ کا اجماع بھی بتاتے ہیں، چنانچہ کتب عقائد میں ہے ”ثُمَّ الْأَجْمَاعُ عَلَى أَنَّ نَصَبَ الْإِمَامِ وَاجِبٌ لَّـ“۔

اہل علماء حضرات جانتے ہیں کہ حنفی اصول میں اجماع کے چند مراتب ہیں۔ مثلاً تمام صحابہؓ کا اجماع، بعض صحابہؓ کا اجماع، مابعد صحابہؓ کا اجماع پھر ایک اور اجماع۔ ان سب میں قوی اجماع صرف پہلا ہے۔ اور یہاں وہی اجماع ہے، اس کے منکر کا حکم بیان کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے آپ ہی حوالے پر ملاحظہ فرمادیں (عبر اس ۳۳۸)۔ نیز یہ بھی جان رکھیے کہ اگرچہ اجماع ناسخ نہیں ہے۔ جیسے کہ علامہ ابن حجر۔ رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے ”وَأَمَّا الْإِجْمَاعُ فَلَيْسَ بِنَاسِخٍ“ (نزہۃ النظر ۵۱)۔ لیکن ملا علی قاری حنفی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ جو اجماع کتاب و سنت پر مستند ہو وہ کتاب و سنت سے اقویٰ (حجت) ہے۔ دلیل یہ پیش کی ہے کہ کتاب و سنت کے الفاظ میں تو دوسرے معانی کا احتمال ہوتا ہے، نیز اس میں تقدم و تاخر اور تعمیم و تخصیص کے احتمالات جاری ہوتے ہیں اور اجماع ان سب سے محفوظ ہوتا ہے۔ (شرح قاری نزہۃ النظر ۱۰۴)۔ امیر ہونا ایک تو اجماعی مسئلہ پھر جس اجماع کا یہ حال ہو پھر یہ کتنی مضبوط بات ہوئی!!۔

اور اس سے بڑھ کر دلچسپ بات یعنی مسلمانوں کی ذمہ داری کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے امیر منتخب کریں انتخاب کی یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ پر ذمہ داری ہونے کی بات شیعہ لوگ کہتے ہیں نہ کہ ہم یعنی امام کو طے کرنا واجب تو ہم دونوں کے نزدیک ہیں لیکن طریقہ و وجوب میں اختلاف ہے ہم وجوب علی الخلق کے قائل ہیں اور وہ وجوب علی اللہ کے قائل ہیں۔ ”وَأَتَمُّا الْخِلَافَ فِي أَنَّهُ يَجِبُ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى أَوْ عَلَى الْخَلْقِ“ (شرح عقائد ۱۰۹، ۱۱۰) لہذا اب تو عوام کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس اعتقادی مسئلہ سے اور اپنے پر عائد ذمہ داری سے اولاً تو واقف ہوں اور پھر اس پر قائم ہوں، نہ یہ کہ اس بارے میں کسی پر اعتماد کریں اور عقیدت و محبت کے شکار ہو کر ”خَرَوْا صَحْمًا وَغُمِيًّا“ کے مصداق بنیں اور عمل کو ترک کریں۔

واجب کی ایک دلیل علماء۔ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اجماع کی دی۔ اب دوسری دلیل بھی دیکھیے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ نے سب سے مقدم اور اہم ذمہ داری امام کو طے کرنا سمجھا۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ کی تجہیز و تدفین پر بھی مقدم اسی کو کیا اور جب تک حضرت ابو بکر۔ رضی اللہ عنہ۔ خلیفہ طے نہیں ہو گئے تدفین کو عمل میں نہیں لائے۔ نیز دوسرے بھی سنگین حالات تھے مثلاً لوگوں کا مرتد ہو جانا وغیرہ۔۔۔ لیکن سب نے اسی کو مقدم کیا۔ اور یہی حال ہر خلیفہ کے انتقال پر بھی ہوا کہ جب تک دوسرا خلیفہ طے نہیں ہوا سارے کام مؤخر کیے۔ (شرح عقائد ۱۱۰)۔ یہ ہے واجب کی دلیل کیا اب بھی کوئی شبہ کرنا درست ہوگا!! ذکر کردہ مسئلہ کے واجب ہونے کو علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب ”ہماری ملی ذمہ داریاں“ میں بیان کیا ہے۔ اور شورائی نظام والوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ جس امام و امیر کا واجب ہونا ثابت ہوا شرعاً اس کا ایک ہونا بھی ضروری ہے متعدد امام درست نہیں چنانچہ اسے ذیل کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیں۔

پھر مسلمانوں کے امیر کا صرف ایک ہونا بھی ضروری ہے

مسلمانوں کے نظام کے لیے جہاں امیر ہونا واجب ہے وہاں اس کا ”بدلیل اجماع“ ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ متعدد امیروں کا ہونا باطل ہے۔ لہذا متعدد امام و امیر کو ماننا اور اس پر عمل اختیار کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع کے بھی خلاف ہے۔

دلیل اس کی امام قرطبی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے مہاجرین و انصار کے درمیان اپنے اپنے ایک ایک امیر کے نظریہ کی تردید میں حضرات شیخین کے طرز عمل کو جو پیش کیا ہے وہ ہے، کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے دونوں جماعتوں کو حدیث سے استدلال کر کے اپنے خیال سے روکا تو تمام نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور سب ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مجتمع ہو گئے۔ ”فَرَجَعُوا وَاَطَاعُوا“ (الجامع لاحکام القرآن ۱/۲۶۴)۔ اور کتب عقائد میں اس شبہ کا بھی ازالہ کر دیا کہ چلیے شوری نہیں امیر ہی سہی لیکن دو علاقے کے الگ الگ دو امیر تسلیم کیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ تو اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی اور فرمایا ایسا درست نہیں۔ ”فَإِنْ قِيلَ لِمَ لَا يَجُوزُ إِلَّا كِتْفَاءُ بَذِي شَوْكَةٍ فِي كُلِّ نَاحِيَةٍ وَمِنْ أَيْنَ يَجِبُ نَصَبُ مَنْ لَهُ الرِّيَاسَةُ الْعَامَّةُ قُلْنَا لِأَنَّهُ يُؤَدِّي إِلَى مُنَازَعَاتٍ وَمُخَاصَمَاتٍ مُفْضِيَةٍ إِلَى اخْتِلَالِ أَمْرِ الدِّينِ وَالْدُّنْيَا“ (شرح عقائد ۱۱۰)۔

بلکہ بڑے ڈرنے کی بات تو سنن ابی داؤد کی حدیث نے پیش کی ہے۔ اللہ اکبر۔ حدیث شریف میں ہے آں حضرت ﷺ نے فرمایا ”میری امت میں نئی نئی باتیں پیش آئیں گی۔ یہ جملہ آپ نے سب بار فرمایا۔ لہذا جو کوئی مسلمانوں کے درمیان باوجودیکہ وہ (ایک امیر پر) مجتمع ہوں تفریق ڈالے تو اسے قتل کر دو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔ یعنی یہ نہ دیکھو کہ کتنے بڑے رتبہ کا

آدمی ہے“ (سنن ابی داؤد ج ۲/۲۴۲)۔ کتنی بڑی بات ہے!! کسی پر انگلی اٹھانا تو گناہ ہے، لیکن ہم جس دین اور قرآن و حدیث کو مانتے ہیں اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر یہ الزام دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے خلاف باتیں کرتے ہیں تو یہاں ارباب شوریٰ حضرات کو باطنی اور شرعی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ جس شورائی نظام کے وہ علمبردار ہیں کیا یہ دینی تعلیمات و ہدایت کے موافق ہے کہ مخالف۔۔۔۔۔

زبردستی امیر بننے والے کی بھی اطاعت ضروری ہے

اسلام میں اجتماعیت کو برقرار رکھنے کا اتنا اہتمام ہے کہ اگر اجتماعیت مٹنے کے اندیشے سے اور افتراق سے بچنے کے خیال سے بالفرض کوئی شخص مسلمانوں کا زبردستی بھی امیر بن کر اس کا دعویٰ کرے کہ میں مسلمانوں کا امیر ہوں تو اس کی بھی اطاعت کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ اللہ اکبر۔ کس قدر اسلام کے اصول ہیں!! اسلام نے اس کو تو نظر انداز کر دیا کہ ایک شخص بغلبہ زور امیر بن جائے، لیکن مسلمانوں کی اجتماعیت میں پھوٹ و ٹوٹن کو نظر انداز نہیں کیا۔ حالاں کہ اسلام اس کو بھی جانتا ہے کہ جو شخص بزور بازو امیر بنے گا تو کچھ لوگ تو اس کے مخالف یقیناً ہوں گے تو افتراق تو اس صورت میں بھی ہے لیکن اس کی پرواہ اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ امیر بن کر اس شر و فساد کا خاتمہ کر سکتا ہے جس کے لیے ضرورت پڑے تو وہ مخالفت کرنے والے کو قتل بھی کر سکتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا روایت میں ہے۔ تو پھر افتراق کو دور کر کے اجتماعیت کو بچایا جاسکتا ہے۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم وہ روایت درج ذیل ہے۔

حدیث شریف میں ہے آں حضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور امیر کی بات کو سننے اور ماننے کی چاہے تم پر کوئی غلام زبردستی ہی کیوں

امیر نہ بن جائے۔ ”اَوْصِيَكُمْ بِتَقْوَى اللَّهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ“ (سنن کبریٰ للبیہقی ۱۹۵/۱۰)۔ اس کے علاوہ امیر کی اور اس کی اطاعت کی اہمیت تو قرآن وحدیث میں دسیوں جگہ ہے، جسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ حدیث شریف میں سفر میں بھی امیر بنانے کا حکم ہے اور اسی وجہ سے دعوت وتبلیغ میں نہ صرف سفر میں بلکہ مشورہ میں اور گشتوں میں اور کم وبیش وقت راہ خدا میں نکلنے والوں میں وغیرہ، قدم قدم پر اس حدیث پر عمل کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پورے زمانہ تبلیغ میں بھی تین مشہور ومعروف امیر دنیا نے تسلیم کیے ہیں۔ گویا خدا نے جب حالات سازگار تھے اسی وقت سے امیر کی امارت کا بیج ڈلوا دیا گویا نمونہ قائم کر دیا آنے والے زمانہ کے لیے کہ جب حالات ناموافق ہوں تو کون کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ بس یہی زمانہ آزمائش کا ہے! رہا مسئلہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی امارت کا تو قابل وثوق ذرائع سے ظاہر ہے کہ وہ ہی اس وقت امیر ہیں۔ اور ان کے امیر ہونے میں بالکل وہی صورت حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائی سے پیش آئی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے شوری بنا کر حضرت عثمان کی خلافت کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ وہ از خود امیر بنے نہیں بلکہ جو شوری بنی تھی ان میں سے تین اکابر ہم تھے اب ان تین میں سے حضرت مولانا بیچ گئے ہیں پس ان کا امیر ہونا گذشتہ امیروں کی جانب سے متعین کردہ طریقہ سے ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بنائی شوری کی حقیقت

شاید اس بات کی صراحت کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو افراد پر مشتمل شوری بنائی تھی وہ نہ مستقل ”امیر“ کی حیثیت سے بنائی تھی اور نہ دائمی وقت کے لیے بنائی تھی بلکہ وہ ایک امیر طے کرنے کے لیے تھی وہ بھی تین دن میں۔ لیکن ضرورت اس لیے پیش

آ رہی ہے کہ اس کو نہ صرف عوام نے بلکہ علماء حضرات نے بھی ضرورت سے زائد اہمیت دی ہے اور اس میں وہ خود بھی غلطی پر ہیں اور دوسروں میں خلاف حقیقت کی تشہیر بھی کر رہے ہیں۔ ”ضَعَفَ الظَّالِمُ وَالْمُظْلُومُ“ کی طرح۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آئیے اس شوری کی حقیقت کیا ہے معلوم کرتے ہیں۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرت پر تو مختلف کتابیں ہیں لیکن مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ جس میں قدم رکھ دیں پھر دائیں بائیں جھانکنے کی خاص ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت نے بڑے ہی شرح وبسط سے سیرت پر کلام کیا ہے ہم انہیں سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک طویل حدیث بیان کی ہے جس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۶ افراد کو حکم دیا کہ تم آپس میں مشورہ سے اپنوں میں سے ایک کو امیر طے کرو اور اس کے بعد جو امیر کی مخالفت کرے اس کو قتل کر دو۔ ”فَتَشَاوَرُوا فِي أَمْرِكُمْ وَأَمَرُوا عَلَيْكُمْ رَجُلًا مِنْكُمْ فَمَنْ خَالَفَهُ فَاصْرِبُوا رَأْسَهُ“ (ازالۃ الخلاف مترجم ۲۸۲/۴) تھوڑے آگے جا کر یہی جملہ الفاظ کی کچھ تبدیلی سے یہ ہے ”وَتَشَاوَرُوا فِي أَمْرِكُمْ فَأَمَرُوا عَلَيْكُمْ رَجُلًا مِنْكُمْ فَإِنْ خَالَفَكُمْ أَحَدٌ فَاصْرِبُوا رَأْسَهُ“ (۲۸۳)۔

یہ تو صاف ظاہر ہو گیا کہ شوری صرف امیر طے کرنے کے لیے تھی نظام کو چلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے امیر طے ہو جانے کے بعد اس کی مخالفت کرنے والے کو قتل کر دینے کا بھی حکم فرمایا۔ شورائی نظام کو درست سمجھنے والوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ابھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ پھر اس شوری نے امیر طے کیا یا نہیں اور اگر کیا تو کتنے وقت میں۔ وہ ہم دوسری جگہ سے پیش کر دیتے ہیں۔ شرح عقائد میں ۶ افراد کو معاملہ تفویض کرنے کا ذکر ہے چنانچہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کو منتخب کیا۔۔۔ جس سے شوری کا مرتفع ہو جانا قطعی ہے لیکن یہ عمل کتنے دنوں میں ہوا؟ وہ یہاں نہیں ہے لیکن شارح شرح عقائد جامع المعقول

والمعتول محقق علوم علامہ محمد عبدالعزیز فرہاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔ فَاخْتَارَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ عُمَانًا وَبَايَعَهُ بَعْدَ ثَلَاثِ لَيَالٍ مِنْ مَوْتِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ۔ (نبراس ۳۰۶)۔ اب تو چاند ہو گیا اور ظاہر ہو کر ثابت بھی ہو گیا کہ کل عید الفطر ہے۔

لہذا اگر کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ کا سہارا لے کر شورائی نظام کے برحق ہونے کا دعویٰ کرے اور اب بھی وہ رمضان سمجھ کر روزہ رکھنے کو عبادت تصور کرے تو اس کی قطعاً اجازت نہیں یہ عبادت نہیں یہ اپنی نفسانیت ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کیوں کہ قرآن وحدیث اور سیرت میں اس ایک واقعہ کے سوا کسی بھی جگہ شورائی نظام کا سراغ ”فی علمنا“ نہیں ملتا۔ اگر قارئین حضرات کو کوئی سراغ ملے تو ہمیں مطلع فرماویں۔ لیکن یاد رہے کہ آپ آیت شریفہ ”وَنَشَاوَهُمْ فِي الْأَمْرِ“ اور ”وَأَمَرَهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ کو پیش فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں کہ یہ آیات خارج از بحث ہیں۔ کیوں کہ ان میں اس شورائی نظام کی کوئی تعلیم ہے ہی نہیں جس معنی میں آج لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

لہذا ہم ادباً گزارش کرتے ہیں آج جس معنی میں دعوت کے اکابر حضرات۔ دامت برکاتہم العالیہ۔ کی جانب سے ”عالمی شوریٰ“ کے نام سے نظام چلایا جا رہا ہے یہ کوئی محقق بات نہیں۔ کیوں کہ اگر ارباب شورائی حضرات یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی بنائی شوریٰ کے تمام حضرات بمنزلہ امیر واحد کے ہیں لہذا اس کی گنجائش ہے تو یہ بھی گنجائش کی حد میں نہیں ہے کیوں کہ کتابوں میں اس کی بھی تردید موجود ہے۔ مجھے معاف فرماویں مجھے کسی کے پیچھے پڑنے کا کوئی جذبہ ہے نہ شوق وعادت لیکن جو حق ہے اس کے کہنے کی ایک بیماری ہے یہ اظہار حق کی ایک ذمہ داری اور امانت ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ ”وَتَرَكَ الْخِلَافَةَ شُورَىٰ بَيْنَ سِتَّةٍ... بِأَن يَخْتَارُوا أَصْلَحَهُمْ لِلْخِلَافَةِ وَلَمْ يَقْصِدْ أَنْ يَكُونَ كُلُّهُمْ خُلَفَاءَ يَتَشَاوَرُونَ فِي الْأُمُورِ، فَإِنَّ تَعَدُّدَ الْخُلَفَاءِ بَاطِلٌ“ (شرح عقائد ۱۱۴ از نبراس ۳۰۵)۔

اس جگہ شورائی نظام کے لوگ شرع عقائد کی صرف ایک عبارت سے استدلال کر سکتے ہیں جو ۱۱۳ پر ہے۔ جس میں اعتراض کے بعد بذریعہ جواب یہ مقصد حاصل کیا ہے کہ ”پوری شوریٰ بمنزلہ امام واحد کہ ہے“ وَأَمَّا فِي الشُّورَىٰ فَالْكُلُّ بِمَنْزِلَةِ إِمَامٍ وَاحِدٍ“ (شرح عقائد ۱۱۳، ۱۱۴) کہ ہماری شوریٰ بھی امام واحد کے درجہ میں ہے۔ لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے کیوں کہ محشین اور شارحین نے نفس اس اعتراض و جواب ہی کو بے بنیاد بتایا ہے۔ کیوں کہ یہ شوریٰ بنانا ”مجلس عاملہ کے درجہ میں نہیں تھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور اس عرصہ میں بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو امام“ مقرر کیا تھا (جواہر الفرائد شرح عقائد ۶۶۹) اور لکھا ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بحوالہ ابن سعد روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے وفات سے کچھ پہلے ابو طلحہ انصاریؓ کو بلایا اور فرمایا کہ پچاس انصار صحابہ کو لے کر اس گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو جاؤ جہاں یہ ۶ حضرات جمع ہیں، اندر کسی کو بھی جانے مت دینا اور تین دن سے زیادہ مہلت بھی مت دینا یعنی تین دن کے اندر امیر طے ہو جائے۔ تو اب شارح کا اعتراض و جواب کا تانا بانا ہی درست نہیں، جس پر شوریٰ والوں کا استدلال موقوف تھا۔ (نبراس ۳۰۵، ۳۰۶)۔

خلاصہ یہ کہ پوری شوریٰ کو ایک امام کے درجہ میں مان کر کام چلانا بھی درست نہیں لہذا ”شورائی نظام“ کی تعمیر جو شبہات پر قائم تھی وہ سخت زلزلہ کا شکار ہو کر منہدم ہو چکی اور ثابت ہو گیا کہ اسلام کا نظریہ صرف ”امارت“ کا ہے (واللہ اعلم)۔

سخت حیرت کی چیز ہے کہ اس مسئلہ میں ہمارے اکابر حضرات چشم پوشی سے کیوں کام لے رہے ہیں، مان لیا کسی وجہ سے وہ ”مرکز نظام الدین“ نہیں رہ سکیں لیکن اس مسئلہ میں شرعی تعلیمات کو کیسے نظر انداز کر رہے ہیں !! ہم یہ بات ان کی مزاحمت میں نہیں کہہ رہے ہیں یہ ہمارے بڑے ہیں ہمیں ان کی قربانیاں معلوم ہیں۔ بلکہ ہم تو صرف ایک شرعی واضح مسئلہ کے خلاف جس شورائی نظام کی بنیاد ڈال کر جو کام کر رہے ہیں اس پر حیرت کے اظہار میں کہہ رہے

ہیں، کیوں کہ کسی بھی بڑے رتبے والے شخص سے کوئی ایسا امر پیش آوے تو یہ سب ہی کے نزدیک قابل تعجب ہوتا ہے (واللہ خیر حافظا)

ہم پہلے بھی اشارہ دے چکے ہیں اور اب دوبارہ بھی، کہ ہماری کسی بڑی شخصیت سے عقیدت و محبت، ان سے نسبی تعلق یا ان سے علاقہ اور وطن کا رشتہ ہمارے دینی کسی اہم مسئلہ میں ہم سے دینی غلط قدم اٹھانے کا، بالفاظ دیگر ”تعاون علی الاثم“ کا ذریعہ اور سبب نہ بنے، اسے سمجھنے کی ذمہ داری ہر مومن کی خود اپنی ہے۔ ہمارا دین اتنا کمزور اور سست نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے نسبی تعلق میں یا عقیدت میں فروخت کر دیں یعنی فراموش کر دیں یا اس لیے نظر انداز کر دیں کہ ہم پر ان کا قدیم و عظیم احسان یاد باؤ ہے ”اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ ذٰلِكَ“۔

ہمیں ایسے موقع پر ایمانی صفات ”خوف ورجا“ اور اس کے نتائج ”نفع وضرر“ کو صرف خدا سے وابستہ کر کے ”حقیقت دین“ کی پیروی کرنی چاہیے نہ کہ رواجی دین کی، ورنہ اس کا خمیازہ ہمیں ہی اٹھانا ہوگا، (واللہ الموفق)۔ یہی بات حضرت علیؑ کے واقعات سے ملتی ہے لکھا ہے کہ ”کبھی کوئی طاقت و شخص اپنی طاقت کی وجہ سے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی امید نہ کر سکتا تھا اور کمزور شخص ان کے انصاف سے مایوس نہ ہوتا تھا“۔ (ازالۃ الخفاء)۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال کی توجیہات

ما قبل کی تمام تفصیل اور اس کے مباحث ذہن نشین رکھیے ورنہ اشاروں سے آپ پورے طور پر سمجھ نہ سکیں گے اور ہم اختصار کے پیش نظر ایک ایک چیز کو تفصیلاً بیان کرنے سے معذور ہیں۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ”دعوت و تبلیغ کی جدوجہد کی نرالی شان۔۔۔ وجوہ اعتراضات۔۔۔ رجال دین کے اقوال اور ان کا قابل تاویل ہونا۔۔۔ علوم اسلامیہ کی وسعت۔۔۔ علوم ظاہرہ و باطنہ کے درمیان کی نزاکتیں۔۔۔ ان کی پانچ مثالیں۔۔۔ اور تمہیدی امور و اصول۔“

تاویلات سے پہلے کچھ ضروری نظائر

(۱) امام رازی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ متکلمین کا قول نقل فرماتے ہیں کہ ”جس نے خدا کی عبادت حصول ثواب کے لیے یا عذاب سے ڈرتے ہوئے کی تو اس کی عبادت ہی صحیح نہیں۔ حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل ضروری ہے ورنہ وہ شخص کافر ہو جائے۔ کیوں کہ یہ نیت خاص لوگوں کے اخلاص کے تو منافی ہے لیکن عام اخلاص کے منافی نہیں ہے۔ پھر وجہ کفر بیان کی اور تاویل کی صورت یہ نکالی کہ اس شخص نے وہ عبادت چاہے خدا کی نیت سے نہیں کی ہے لیکن ثواب و عذاب کی جہت تو ملحوظ ہے جو شریعت میں اعلیٰ درجہ میں نہ سہی لیکن ادنیٰ درجہ میں تو ضرور مطلوب ہے (لہذا وہ عبادت اب صحیح ہے) اور اگر یہ مذکورہ تاویل بھی نہ کی جائے تو اس وقت یقیناً وہ عبادت صحیح نہ ہوگی پھر تو وہ شخص کافر ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ مستحق عبادت ہے اور یہ جہت کسی بھی طرح پائی نہیں گئی۔ (مرقات ۱۵۹/۳)۔

(۲) مسئلہ ہے ”ایمان“ کا۔ ایمان دو طرح کا ہے۔ ایک ایمان اجمالی اور دوسرا ہے ایمان تفصیلی۔ اب علماء کے دو جگہ کے قول میں کتنا تضاد ہے وہ دیکھئے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ اجمالی ایمان تفصیلی ایمان سے (درجہ میں) کم نہیں۔ پھر وہ ہی علماء دوسری جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تفصیلی ایمان، اجمالی ایمان سے ازید واکمل ہے۔ بالکل ظاہری تضاد ہے۔ اور اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ لیکن اس تضاد کو انہی علماء نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ یہ دو الگ الگ جگہ کے لحاظ سے دو باتیں کہی ہیں۔ اب غلط ہونے کا شبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ جب نفس ایمان و تصدیق سے متصف ہونے کی جگہ ہو جس سے آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں بری الذمہ ہو جائے تو اس میں دونوں برابر ہیں۔ لیکن اس جگہ کے علاوہ کا مقام ہو تو وہ برابر نہیں کیوں کہ اجمالی میں تصدیق واحد ہے اور تفصیلی میں بکثرت تصدیقات ہیں۔ اسی بات کی وجہ سے نتیجہ کے طور پر علماء نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک اجمالی ایمان ہر ایک کے حق میں فرض عین ہے اور تفصیلی ایمان فرض کفایہ ہے۔ اور دوسری بات یہ

کہی کہ عوام میں اجمالی تصدیق ہوتی ہے اور علماء میں تفصیلی لہذا علماء کا مقام عوام سے اس معنی کر بھی بلند ہے۔ (شرح عقائد ۹۳)۔

(۳) صاحب عقائد نسفیہ۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے نبیوں اور رسولوں کے مبعوث کیے جانے کے مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ”ارسال رسل میں حکمت ہے“ انہوں نے ”حکمت ہے“ کہا، جو ایک جامع لفظ ہے۔ کیوں کہ اس کے بارے میں تین قول ہیں ایک واجب۔ دوسرا ممکن۔ تیسرا ممنوع۔ واجب ہم اہل السنہ (ماتریدیہ) اور معتزلہ دونوں کے نزدیک ہے۔ لیکن وجوب کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے۔ ہم وجوب من اللہ اور وہ وجوب علی اللہ کے قائل ہیں۔ دوسرا قول بعض متکلمین یعنی جمہور اشاعرہ کا ہے۔ اور تیسرا قول براہمہ اور سمنیہ کا ہے۔

فائدہ: غور کیجیے پہلی نظیر میں تاویل کو ضروری بتایا گیا، دوسری میں تاویل سے تضاد کو ختم کیا گیا اور تیسری میں جامع لفظ استعمال فرما کر تمام اقوال کو شامل کیا گیا۔ بس ہم ان تینوں مثالوں سے یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ کسی مسلمان کا قول اگر بظاہر خلاف شرع محسوس ہو تو اس کی کسی بھی طرح تاویل کر کے اس کو غلط الزام سے بچانا چاہیے۔ جیسا کہ مذکورہ نظائر میں آپ نے دیکھا۔ اور اگر کوئی فیصلہ لینا مجبوری بھی ہو تو ایسی حکمت والے کلمات کو استعمال کرنا چاہیے کہ نہ اس پر کوئی الزام ہو نہ گمراہی کا شبہ۔ کیوں کہ آدمی اعمال ترک کرے یہ ممکن ہے لیکن اعتقادِ اوہ مذہب پر حملہ کرے یہ ممکن نہیں۔ ”واللہ الموفق“۔ بس یہی باتیں ملحوظ رکھ کر اب ہم حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات کی تاویلات پیش کرتے ہیں بنظر انصاف اور تہقظ و تعمق سے سمجھنے کی کوشش فرماویں۔

(۱) اعتراض موبائل سے متعلق اقوال کی توجیہ: حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے موبائل سے متعلق جو جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ سب ہی تقویٰ کے لحاظ سے فرمائی ہیں فتویٰ کے لحاظ سے نہیں۔ اس سے نہ تو مسئلہ فقہیہ سے ناواقفیت ہے، نہ اپنی طرف سے شریعت میں

کوئی مداخلت ہے اور نہ حضرات علمائے دیوبند سے مزاحمت ہے۔ بلکہ عوام کو اس کی مضرتوں سے بچانے کے لیے ممانعت فرمائی ہے جس میں قصداً شدت و تغلیظ اختیار کی ہے کیوں کہ مسند تقویٰ اور منصب اصلاح و تربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے فرمایا ہے ”فَاعْلَمْ أَنَّ لِكُلِّ فِرٍّ خَاصَّةً، وَلِكُلِّ مَوْطِنٍ مُّقْتَضًى“ کہ ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱۵۸)۔ جس طرح مدارس اور دیگر دنیوی ادارے اپنے عملہ پر پابندی عائد کرتے ہیں تاکہ مقاصد میں خلل واقع نہ ہو۔ لہذا تقویٰ و فتویٰ کی جہتوں کو فراموش کر کے دونوں کو ایک ہی سمجھنا منشأً سوال ہے اور دونوں کو علی حدہ تصور کرنا منشأً جواب ہے۔

قرینہ: اس توجیہ کا قرینہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے ”عندی“ فرمایا ہے جس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خود مولانا مسند فتویٰ پر بیٹھتے تو وہی فرماتے جو حضرات علمائے دیوبند نے فرمایا۔ اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جو علماء و عوام حضرت مولانا محمد سعد صاحب کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کے اشاروں پر قربان کر دیتے ہیں اس کے باوجود وہ عمل میں ان کے مخالف ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ انتہائی تقویٰ پر مبنی ہے اور سمجھتے ہیں کہ مولانا اس کی ممانعت شرعاً نہیں تہذیباً کر رہے ہیں۔

اس توجیہ پر بھی سوالات اٹھ سکتے ہیں مثلاً اگر تقویٰ مراد ہے تو فقہی اصطلاح ”ناجائز وغیرہ“ کیوں استعمال کی ہے۔ اور اجرو ثواب کی نفی کیسے درست ہے؟ اور قرآن شریف کی اہانت کیسے؟ تو ان سب کے جوابات ہمارے ماسبق کے مباحث میں موجود ہیں۔ البتہ ایک سوال اہم ہے۔ وہ ہے علماء سوء کہنا اور یہود و نصاریٰ کی ذہنیت سے متاثر ہونا۔ تو ہم یقیناً کہیں گے کہ یہ علماء حضرات کی شان میں تنقیص اور ان کی بے ادبی ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے یہ بات کہی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا نے ایسا کہا ہی نہ ہوگا یا اسلوب کچھ اور ہوگا، اگر کہا ہو تو رجوع

کرنا چاہیے بلکہ حضرت کی ذات سے قوی یقین ہے کہ رجوع کر ہی لیا ہوگا۔ لیکن یہ سب بھی نہ ہو تب بھی بات تو بن سکتی ہے، وہ اس طرح کہ یہ جملہ عام حضرات علماء دیوبند کے حق میں نہیں بلکہ دعوت و تبلیغ میں فعال علماء حضرات کے حق میں ہے خصوصاً جو مولانا کے منشا کو اچھی طرح جانتے ہیں پھر بھی اس کا استعمال کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ ضمیر کا مرجع اقرب ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔

تفصیلی توجیہ

اگر مسند تقویٰ کے قول سے تسلی نہیں اوضد بہ مسند فقہ ہے، تو ناجائز کہنے کی بھی توجیہ ممکن ہے۔

(۱) ناجائز کہنا ”سد ذرائع“ کے طور پر ہے، واقع کے اعتبار سے نہیں، تاکہ لوگوں کو فتویٰ کی آخری حد تک جانے سے روکا جائے۔ جیسے عورتوں کے حق میں مسجد سے اور زیارت قبور سے اور تمام کے حق میں اوائی خمر سے ممانعت۔

(۲) یہ بھی سد ذرائع کے طور پر ہے لیکن اس میں دعوت و تبلیغ کی فطرت اس کی قربانیاں پیش نظر ہیں، ورنہ تو ساری دعوت موبائل پر غالب ہو جائے اور جان و مال اور چلت پھرت کی جو جدوجہد مطلوب ہے وہ مٹ جائے اور وہ بے جان و بے اثر ہو کر رہ جائے۔ اور تبلیغی روزمرہ کی کثیر تعداد پر مشتمل مجلسوں میں سینکڑوں گھنٹیاں نمازوں، بیانوں اور تعلیم میں خلل انداز ہوں۔

(۳) از روئے فتویٰ تیسرا جواب ناجائز کو ”ضد صریح“، ”جائز“ نہ لیا جائے۔ اگر ضد صریح لیں گے تو خرابی پیش آئے گی۔

اور قرآن و حدیث میں سنت کو فرض اور فرض کو سنت وغیرہ کے معنی میں لینا پایا جاتا ہے۔ جس سے ناجائز مکروہ کے معنی میں ہو کر جواز کے قریب ہو جائے گا پھر تقویٰ اور فتویٰ میں جوڑ بھی پیدا ہو جائے گا۔

ترجیحات

موبائل کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ اشاعت دین کا ذریعہ ہے۔ یہ عام علماء حضرات کا نظریہ ہے۔ دوسرا وہ اشاعت کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا کا نظریہ ہے۔ پہلا نظریہ فتویٰ ہے یا کہیے کہ فتویٰ کے مطابق ہے۔ دوسرا تقویٰ ہے یا کہیے تقویٰ کے مطابق ہے۔ فتویٰ اور تقویٰ میں تقویٰ رائج ہوتا ہے۔ عام علماء حضرات کے پاس یہی دلیل ہے کہ وہ اشاعت کا ذریعہ ہے۔ جب کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے پاس تقویٰ کے ساتھ وجہ ترجیح بھی ہے اور وہ ہے اس کا حادث و اختراعی ہونا ”بدعت لغوی“ ہی سہی لیکن ہے بدعت جو زمانہ خیر القرون میں نہیں تھی۔ اور تیسری وجہ کہ علماء حضرات بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں خیر کے ساتھ شر کا بھی پہلو ہے اور ”جلب منفعت سے دفع مضرت اولیٰ ہے۔ اسی وجہ سے پہلے پہل علماء بھی اس سے تصویر لینے میں متردد تھے اور آج بھی محطاط علماء ویڈیو کے مقابلہ میں آڈیو کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان وجوہات سے بھی مولانا محمد سعد صاحب کا قول قابل ترجیح ہے۔

نوٹ: ماقبل میں ہم نے لکھا ہے کہ جب کسی کی کوئی بات خلاف شرع ہو تو قول نہیں وجہ قول اہم ہوتی ہے تو ہم نے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی منشا اور وجہ پر غور کیا جس سے یہ توجیہات حاصل ہوئیں۔ جس طرح اقوال رجال دین میں۔

سوال: بات ٹھیک ہے لیکن مولانا نے اس موبائل سے قرآن شریف پڑھنے وغیرہ کی جو تشبیہ پیشاب دانی سے دی ہے وہ ”قول کریمہ“ اور بھدی تشبیہ ہے۔ جواب بلاغت کے اصول میں دیکھ لیجیے اور قرآن شریف میں بھی غور کر لیجیے اس کا جواب ہے۔ دراصل بعض باتیں کراہت پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن وہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں، حقیقت کو واضح کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ مثال یہ ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو بیت اللہ ”مسجد“ میں بھی خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور بعضوں کو ”بیت الخلاء“ میں بھی حاصل ہو جاتی ہے

خلاصہ : یہ کہ علوم ظاہرہ و باطنہ کی بحث اور رجال دین کے اقوال کی وجوہات کو ملحوظ رکھ کر جب مولانا کے قول کی وجہ معلوم کریں گے کہ قائل کس منصب، کس میدان، کس پس منظر میں یہ بات کہہ رہا ہے تو آپ کو سراغ ہاتھ لگ جائے گا اور کوئی بھی خدشہ ذہن میں باقی نہیں رہے گا۔ خلاصہ کے ساتھ لطیفہ یہ بھی اگر اس پوری تفصیل سے بھی جواب سمجھ میں نہ آیا ہو تو آسان طریقہ سے یہ سمجھیے کہ آپ ہمارے گذشتہ مباحث پڑھتے آرہے ہیں ہم نے صفحہ ۸۹ پر لکھا ہے کہ ان اصول و امور کو پڑھے بغیر ہماری جانب سے پیش کردہ توجیہات پڑھنا جائز نہیں۔ اب بتائیے ہم نے یہ ناجائز لکھا اور آپ نے ان کو پڑھے بغیر ہی توجیہات کو پڑھا تو اس ”ناجائز“ کا کیا مطلب؟ اور اس میں جو ممانعت تھی وہ کونسی تھی؟ بس اسی طرح مولانا کی بات سمجھیں۔

تسبیہ : یہ توجیہات تو موبائل سے متعلق اقوال کی تھیں۔ آپ اگر موبائل کے علاوہ اقوال میں جو فقہی اعتبار سے بظاہر متضاد ہیں حل کرنا چاہیں تو انہیں بھی اس مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں خود حل کر سکتے ہیں۔ لہذا ہم بھی بقیہ مسائل میں صرف مختصراً توجیہات پیش کریں گے۔

(۲) **اعتراف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں تنقیص ۱:** حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے بلائے پر چلے گئے جس سے قوم کے بہت سے افراد گمراہ ہو گئے یہ کہنے پر حضرت موسیٰ کی یعنی نبی کی شان میں تنقیص ہے۔ یہ ہے اعتراف۔

۱۔ یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے تمام اقوال میں سب سے سنگین قول صرف دو ہیں۔ ایک یہی دوسرا ”ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی“ جو اس کے بعد نمبر تین پر مذکور ہے۔ ہم نے ۲۵ دسمبر ۱۴۱۰ء کا بیان بذریعہ ”نیٹ“ سنا تو حضرت نے رجوع فرمالیا ہے۔ تب ان دو مسئلوں میں توجیہات کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو رجوع کا علم نہیں یا ہم ”نیٹ“ کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے تو ایسے معترضین کو سمجھانے کے لیے کہ یہ جملہ سبقت لسانی سے نکلا ہوا ہے اور فقہاء کے یہاں عاقل و بالغ کے قول و فعل کی تاویل کی جاتی ہے، بایں وجہ توجیہات ذکر کی گئی ہیں۔ ورنہ اس کی بالکل ہی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ”غلط“ کو صحیح بنانا خود ”غلط“ ہے۔ لہذا ”ہدایت“ والے مسئلہ میں بھی ذکر کی وجہ یہ سمجھیں۔

توجیہ نمبر ایک : جب ہم نے اس بیان کی کلمہ سنی تو صاف صاف دو باتیں حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے فرمائی ہیں۔ ایک بات یہ فرمائی کہ مفسرین نے لکھا ہے۔ اس کا مطلب کسی تفسیر کے حوالے سے کہہ رہے ہیں پھر اعتراض کی گنجائش کہاں؟ دوسری بات یہ کہی ہے کہ میں شعور سے اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ جب مولانا پورے اذعان و یقین سے کہہ رہے ہیں، بے شعوری یا سبقت لسانی سے نہیں فرما رہے ہیں تو وہ کسی نبی کی شان میں تنقیص کیسے کریں گے؟ اگر کسی کو ان جملوں سے تنقیص محسوس ہو وہ اس کی سمجھ ہے لیکن قائل تو شعور سے کہہ رہا ہے۔ پھر تنقیص کا کوئی محل ہی نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو کسی تفسیر سے معلوم نہیں ہوا تو کسی کی لاعلمی دلیل نہیں ہے۔

توجیہ نمبر دو : بنظر انصاف کہہ رہے ہیں کہ ہمیں تو حضرت کی بات سے نبی کی شان میں کوئی تنقیص سمجھ نہیں آتی۔ اس لیے کہ قرآن شریف کا منطوق دیکھیے وہ خود ہی یہ مفہوم دے رہا ہے۔ ہم اس کو آسان طریقے سے سمجھاتے ہیں۔ ”وما اعجلك“ سے ”وعلت“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ”جو کام جس وقت کرنا نہیں تھا وہ قبل از وقت کیا“ پھر ”قَالَ قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے بعد یعنی ان کے نہ رہنے سے قوم گمراہی میں مبتلا ہوئی۔ قرآن کے منطوق سے ہی یہ دو باتیں معلوم ہو رہی ہے کہ مناجات کے لیے جانا قبل از وقت ہوا نتیجہ یہ کہ جانا نہیں چاہیے تھا۔ خلاصہ یہ کہ آیت کا منطوق ہی اعجال کی مذمت پر دال ہے ”بذریعہ ہمزہ استفہام انکاری“ اور اگر مذمت پر نہیں تو غیر مطلوب پر تو ضرور دال ہے پھر تنقیص کیسی؟ (واللہ اعلم)۔ گویا مولانا محمد سعد صاحب جو واقعہ ہے اس کی خبر دے رہے ہیں اسی کو لوگ تنقیص کی تعبیر میں ڈھال کر کیچڑا چھال رہے ہیں!! حضرت یونس علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر چلے گئے جو واقعہ ہے اسی کو کہنا تنقیص کیسے؟ خصوصاً جب اس طرح کہنے سے لوگوں کو اپنے کاموں پر آگاہ کرنا مقصود ہو۔

توجیہ نمبر تین: وما اعجلك میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے جیسے روح المعانی میں ہے جو اعجال

کے غیر مستحسن ہونے پر دال ہے، کوئی کہے کہ نہیں کیوں کہ اس کا سبب و عاقبت ”لترضیٰ“ ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ اس وقت صحیح ہوتا جب اس کے بعد اس افعال سے کسی بھی قسم کا تعرض نہ ہوتا یہاں تعرض ہے۔ ”قد فتنا“ معلوم ہوا افعال سے استنقرار فی القوم ہی بہتر تھا اور یہی بات حضرت مولانا محمد سعد صاحب نے کہی ہے۔ (فلا باس)۔ بلکہ اگر انتہائی تیقظ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہی چاہتے تھے کہ وہ قوم میں رہیں کیوں کہ ”فتنا“ میں نسبت اپنی طرف کی ہے اور من بعدک“ میں غیبت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں حاضری پسندیدہ تھی۔ پھر اعتراض کیسے؟ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر چار : یہ جملہ کسی بھی طرح تنقیص نہیں ہے، کیوں کہ نبی کی دو شان ہوتی ہیں۔ ایک شان ولایت ”تَوَجَّهَ الْعَبْدُ إِلَى الْحَقِّ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى“ اور دوسری شان نبوت ”هُوَ تَوْسِطُ بَيْنِ الْحَقِّ وَالْعِبَادِ“ (نبراس ۳۶)۔ جب دو شان ہیں تو نبی کے کسی وقت میں دونوں میں سے کسی بھی شان پر ہونے کو بتانا باعث تنقیص کیسے ہوگا؟ دونوں ہی شان اس کی ہیں۔ تنقیص تو یہ ہے کہ جو شان اس کی نہ ہو وہ اس کے لیے ثابت کی جائے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو قوم میں ٹھہرنا نبوت کی شان ہے جو ولایت ”لترضیٰ“ پر فی قول رائج ہے (شرح عقائد ۱۱۹)۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا کا قول نہ صرف صحیح ہے بلکہ بہتر ہے اس کی ضد کے مقابلہ میں۔ دیکھیے اس توجیہ نے تو معترض کے قول و مدعی ہی کو قلب کر دیا۔ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر پانچ : قرآن کریم کی آیت شریفہ ملاحظہ ہو ”فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ“ اس میں وظیفہ نبوت ”قوم میں دعوت دینے“ کو مقدم کیا ہے۔ اور ولایت کو وظیفہ نبوت کے ختم پر موقوف بھی کیا ہے۔ ان دو وجہوں سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم میں ٹھہرنا اور انہیں دین پر جمانا بہر حال بہتر تھا جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب فرما رہے ہیں۔ ان توجیہات پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ جو بات بہتر ہے اس کے کہے پر

اعتراض ہو تو وہ خودنا سمجھی کی بات ہے (واللہ اعلم) نیز ہم اقوال رجال دین کی توجیہات وغیرہ میں بتا چکے ہیں کہ وہاں تو ”انبیاء“ جمع کا صیغہ ہے ان سے معرفت میں آگے بڑھ جانا، یا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انبیاء کی جگہ کھڑا ہونا یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ”عبد اللہ بن ثوب کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کی شبیہ دیکھنا یہ سب تنقیص نہیں پھر یہاں کیسے؟ بس تھوڑی سی سمجھ سے کام لینا ہے ان شاء اللہ آپ سمجھ لیں گے۔

(۳) اعتراض یہ ہے کہ مولانا فرماتے ہیں ”ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی، مطلب اللہ کے ہاتھ میں نہیں“۔ العیاذ باللہ۔ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ بات نوٹ کیجیے کہ ہم نے جب کلپ سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی بات سنی تو کیا پایا۔

الف : ۵/۷ منٹ کی کلپ تھی بس۔

ب : مخلوط آواز کی ایسی گونج تھی جس سے سامع صحیح بات سمجھ نہ سکے۔

ج : کلام غیر مربوط تھا۔

ان تینوں باتوں سے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت سے ناراض کسی شخص نے شاید غلط حرکت کی ہے۔ اور آج اس طرح واقع کے خلاف کسی کی تصویر بتانا، کسی کے کلام میں اسی کی آواز میں تبدیلی کرنا وغیرہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ واقع ہوتا ہے جس کا تجربہ راقم کو ہے۔ جیسا کہ اسلام کے خلاف شر پسند لوگ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فتنا کو ہوا دینے کے لیے یہ کسی کی جانب سے خیانت ہوئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائیں۔ یہ شبہ اس لیے ہے کہ حضرت کی بیانات میں ۳ عادتیں معروف ہیں جس کو ہر منصف مزاج محسوس کر سکتا ہے۔

الف : ہر اہم بات کو دو بار کہنا۔

ب : درمیانی رفتار سے صاف صاف آواز میں کہنا۔

ج : ہر اہم بات پر قرآن و سنت اور سیرت سے استشہاد پیش کرنا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام والے مسئلہ کی کلپ سنی تو ان تینوں خرابیوں میں سے ایک بھی نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ بیان کی ایسی بات جس پر یا تو دفع اعتراض موقوف تھا اسی کو ہٹا دیا ہے یا اس پر عدم انشاء اعتراض موقوف تھا اسے ہٹا دیا ہے۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں بلکہ سب ہی کو کہنی چاہیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب ایسی بین خلاف شرع بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ نعوذ باللہ۔ پھر تو کفر کا حکم لگ سکتا ہے کیوں کہ آیت قرآنیہ کا انکار ہے۔ اس کی کوئی توجیہ ہوئی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہیں گے کہ حضرت نے ایسا کہا ہی نہیں اور اگر سبقت لسانی سے یہ بات نکل گئی ہے تو رجوع فرض ہے۔ پھر تو صد فی صد یقین ہے کہ رجوع کر بھی لیا ہوگا۔

ہمیں ان تمام پر سخت حیرت ہے جو مولانا کے اس قول کو لے کر پریشان ہیں۔ کیوں کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی کتاب ”مسجد کی آبادی کی محنت“ ان کے بیانات ہی کا مجموعہ ہے اور دعوت کے ساتھیوں میں تو کافی مشہور بھی ہے خود اس میں کیا لکھا ہے آپ ملاحظہ فرمائیے۔

”۔۔۔۔۔ قدرت اللہ کی ذات میں ہے، اولیاء، انبیاء، فرشتے، جبرئیل سب کے سب محتاج ہیں۔ نبی بھی جس کام کے لیے بھیجے گئے ہیں نا، اس میں وہ بھی محتاج ہیں، مختار نہیں ہیں کہ کسی کو وہ ہدایت دے دیں، کہ نبیوں کو ہدایت کے لیے ہی بھیجا گیا ہے لیکن وہ خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا زور لگا دیا اپنے چچا ابوطالب پر کہ ان کو ہدایت مل جائے اور دوسرے چچا حمزہ کے قاتل وحشی، کہ وحشی کو کوئی قتل کر دے۔ پر اللہ وحشی کو ہدایت دے رہے ہیں اور ابوطالب بغیر ہدایت دنیا سے جا رہے ہیں (مسجد کی آبادی کی محنت ۲۲)۔ دیکھا آپ نے یہ جملہ ”پر اللہ وحشی کو ہدایت دے رہے ہیں“ اتنی صاف بات ہے پھر بھی یہ کہنا کہ مولانا یہ۔۔۔ کہہ

رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے دل کی کھوٹ کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔ اب تو ضرورت نہیں رہتی کہ توجیہات پیش کی جائیں۔ جیسا کہ گذشتہ حاشیہ میں لکھا ہے پھر بھی اگر مولانا سے یہ جملہ نکل بھی گیا ہے تو پھر ذیل کی تاویل آپ کر لیں۔ ہمیں تو ضرورت ہی نہیں۔

توجیہ نمبر ایک : تفسیر و عقائد دونوں فن میں ”ہدایت“ کے بارے میں بحثیں موجود ہیں جس میں دو موقف ہیں ایک اہل السنہ والجماعہ کا دوسرا معتزلہ کا۔ کتب تفسیر میں معتزلہ کا موقف یہ بیان کیا ہے ”الدَّلَالَةُ الْمُؤَصِّلَةُ إِلَى الْمَطْلُوبِ“ یعنی ایسی دلالت جو موصول الی المطلوب ہو بالفعل، اور ایصال بالفعل کے لیے وصول بالفعل ضروری ہے۔ اس قول کے مطابق اللہ کے ہادی ہونے کا مطلب یہ ہوا ”گویا“ اللہ تعالیٰ بندہ کو ”ہاتھ پکڑ کر“ منزل پر کھڑا کر دے۔ دوسرا موقف ہے ہمارا ”الدَّلَالَةُ عَلَى طَرِيقٍ يُؤْصِلُ إِلَى الْمَطْلُوبِ“ (شرح عقائد ۹۶)۔ جس کو اراء طریق کہتے ہیں یعنی صرف ایسے راستے پر چلا دینا جو منزل تک پہنچا سکے۔ چاہے وصول منزل حاصل ہو کہ نہ ہو۔ یعنی کوئی بھی ضروری نہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہمارا قول معتزلہ کے خلاف ہے۔ اب معتزلہ کے قول کو نفی کی تعبیر سے لیجئے ”اللہ تعالیٰ بندہ کا ہاتھ پکڑ کر منزل پر کھڑا نہیں کریں گے“ مولانا محمد سعد صاحب کا قول بن جائے گا مطلب مولانا یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایسی ہدایت نہیں کہ ہاتھ پکڑ کر نماز وغیرہ پر کھڑا کر دیں۔ گویا مولانا مسلک اعتزال کی تردید کر کے مسلک اہل السنہ والجماعہ کی تائید کر رہے ہیں، کیوں کہ ”وبضدھا تتبدین الاشیاء“ یہ قول تولا لق تعریف ہے۔ اور اس سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ جو علم کتابوں میں منقوش ہے اور درس میں منحصر ہے وہ عام خطاب میں جھلک بھی رہا ہے اور چھلک بھی رہا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

اس کی تائید ہم اپنے مطالعہ کے علم سے پیش کر رہے ہیں۔ ایک بڑے عالم نے بڑی

قیمتی بات لکھی ہے جو انہوں نے خدا کے برعکس شیطان کے بارے میں کہی ہے کہ لوگ اپنے گناہوں کا الزام شیطان پر دھرتے ہیں جب کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں شیطان نے کرایا وہ ہمیں گمراہ کرتا ہے تو مولانا نے ان کے نظریہ کی تردید کرتے کہا کہ کیا شیطان تمہارا ہاتھ پکڑ کر گناہ کراتا ہے! ہرگز نہیں، تمہارے ارادہ کا بھی دخل ہے۔ یہ وہی معتزلہ کے مسلک کی تردید ہے جیسے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں تھی، فرق صرف ہدایت و گمراہی کا ہے۔ تو دیکھیے مولانا کا قول کس قدر درست ہے! اور خطباء کا اپنے سامعین کو نیک عزائم پر آمادہ کرنے کے لیے اس طرح کے جملے کہنا نہ عین تقاضہ ہے بلکہ اس طرح کی باتیں سنی بھی جاتی ہیں جس سے لوگ ارادہ کے بعد قدم بھی اٹھائیں۔

تنبیہ: ہم یہاں آپ کے تیقظ کو آ زمانہ چاہیں گے، اس طرح کہ ہم نے (صفحہ پر ۸۸) لکھا ہے ”وَرَنَ اللّٰهُ تَعَالٰی کَیْسَی کا ہاتھ پکڑ کر نہ حق پر کھڑا کریں گے اور نہ اس فتنہ سے نکالیں گے۔“ اور اس سے تھوڑا نیچے جائیے تو یہ جملے پائیں گے ”جب بندہ خود ہدایت نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے چاہیں گے“ دیکھ لیجیے دونوں جملوں کے نیچے سطر بھی لگی ہے۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی ہے، یعنی معتزلہ کی تردید تو ہماری بات سے بھی معتزلہ کی تردید ہو رہی ہے۔ کیوں کہ ہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا ہاتھ پکڑ کر حق پر کھڑا نہیں کریں گے اسی طرح بندہ نہ چاہے تو پھر اللہ تعالیٰ کیسے چاہیں گے!

توجیہ نمبر دو: جس طرح ہادی اللہ تعالیٰ ہے اس طرح مُضِلُّ بھی اللہ تعالیٰ ہے ”إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ“ آپ کا ایک اعتراض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر تھا جس کی توجیہات بھی آپ نے پڑھ لیں، لیکن اُسی آیت شریفہ میں آگے ہے ”وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ“۔۔۔“ مولانا محمد سعد صاحب ہدایت کی نفی اللہ کے قبضہ سے کرتے ہیں، ہمیں بتائیے آپ یہاں ”ضلالت“ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس آیت کی وجہ سے ضلالت کی نفی

خدا کے قبضہ سے آپ کو کرنا ہوگی۔ العیاذ باللہ۔ اور اگر نفی نہیں کرتے تو تاویل کرنا ہوگی۔ اگر نفی کرتے ہیں تو باوجودیکہ وہ قرآن شریف کی بات ہے آپ خود گمراہ کہلائیں گے لہذا تاویل متعین ہوگئی۔ لہذا جس طرح آپ یہاں تاویل کریں گے بس آپ کو وہی تاویل حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں کرنی ہے۔ ”فَمَا كَانَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا“ (واللہ اعلم)

توجیہ نمبر تین: حضرت مولانا محمد سعد صاحب اس جملہ سے تقدیر کی اہمیت سمجھاتے ہیں۔ کسی چیز کی اہمیت بتانے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے زندگی، امید اور موت کو خطوط کھینچ کر سمجھایا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی تقدیر لکھی لی ہے اور وہ بندوں کے سارے کاموں سے (جس میں ایک کام ہدایت کا بھی ہے) فارغ ہو چکے ہیں تو اب وہ بتقاضہ اس کی سنت و عادت۔ نہ کہ قدرت۔ کسی کو ہدایت بھی نہیں دیں گے۔ یعنی جس طرح اور کاموں سے اللہ تعالیٰ فارغ ہو چکے ہیں اب کوئی کام انجام نہیں دیں گے تو اب ہدایت بھی نہیں دیں گے، لہذا ہدایت کی نفی اللہ تعالیٰ سے درست ہے۔ اس کا قرینہ دو احادیث ہیں۔ ایک ”جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ“ دوسری ”فَرَعَ رَبُّكُمْ مِّنْ عِبَادِهِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ“۔ جس تقدیر کو سمجھانے کے لیے دسیوں احادیث وارد ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

سوال: اس توجیہ پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس توجیہ سے یہ تو ثابت ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نہیں دیں گے یعنی وقوع ہدایت کی نفی، لیکن حضرت مولانا کا قول وقوع کی نفی کا نہیں قدرت کی نفی کا ہے وہ ثابت نہیں ہوتا۔

جواب: علماء حضرات توجہ سے سمجھیں، دونوں ہی ”عدم انتفاع“ میں برابر ہے چاہے وقوع چاہے قدرت بایں معنی نفع حاصل نہ ہونے کی مراد میں دونوں برابر ہے۔

توجیہ نمبر چار: آپ حقیقت و مجاز کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ”زَيْدٌ كَالْأَسَدِ“ اللہ تعالیٰ ہادی بالذات ہیں بمعنی وہ حقیقی ہادی ہیں اور قرآن شریف ”إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي“ اور نبی

علیہم السلام ”وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“ ہادی بالسبب ہیں یعنی مجازی ہیں۔ حضرت مولانا مجازی معنی میں ہدایت کی نفی کر رہے ہیں اور یہ سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے معنی میں ہادی نہیں ہیں جیسے قرآن اور نبی (مجازی) بلکہ وہ تو ہادی بالحقیقت اور بالذات ہیں ان کے ہاتھ میں تو اصل ہدایت ہے۔

ہم اساتذہ جب کسی چیز کی حد و تعریف طلبہ کو سمجھاتے ہیں تو اچھی تفہیم کے لیے تعریف میں اگر مثبت قید ہے تو منفی کو بھی اور منفی قید میں مثبت کو بھی پیش کرتے ہیں، اس طرح حقیقت میں مجاز کو اور مجاز میں حقیقت کو بھی پیش کرتے ہیں تاکہ بات بذریعہ ضد واضح ہو جائے۔ تو مولانا یہاں مجاز کی نفی سے معنی حقیقی کو تقویت دے رہے ہیں۔ گویا وہ درسی نزاکتوں کو یہاں بھی ملحوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر فی الحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کو ہادی نہ مانتے تو ۲۴ گھنٹے یہ جملے استعمال نہ فرماتے ”اللہ ہی کرتے ہیں“ ”اللہ ہی کے کرنے سے ہوتا ہے“ کیوں کہ ان ہی میں سے ایک کام ہدایت دینا بھی ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ : دیکھیے اب تک چار تو جیہات ہو چکیں۔ ان تو جیہات سے کسی بھی طرح کام بن جاتا ہے بلکہ کافی حد تک تو جیہات ٹھیک بھی لگ رہی ہیں۔ کیوں کہ ساتھ میں قرآن بھی ہیں تو پھر اب ان کے خلاف کسی طرح کے اقدامات اختیار کرنا کتنا صحیح ہے!!۔

توجیہ نمبر پانچ : اگر کتب علم کلام کو دیکھیں تو ہدایت کے بارے میں ہم اہل السنہ والمعتزلہ میں یہ اختلاف مذکور ہے۔ عند المعتزلہ ہدایت کا معنی ہے ”بیان طریق الصواب“ یعنی درست اور حق راستہ بتادینا۔ اور ہمارے یہاں اس کا معنی ہے ”خَلْقِ اهْتِدَاءٍ فِي الْعَبْدِ“ یعنی بندہ میں اهتداء کو پیدا کر دینا (شرع عقائد ۹۶)۔ حضرت مولانا محمد سعد صاحب جس ہدایت کی اللہ سے نفی کر رہے ہیں وہ بیان طریق صواب کے معنی میں ہے تاکہ معتزلہ پر رد ہو جائے اور بذریعہ ضد یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس معنی کو ہادی ہے کہ اس نے بندہ میں اهتداء کا خلق کیا

ہے۔ کیوں کہ قاعدہ ہے ”المفہوم لا یعارض المنطوق“ یعنی منطوق کا جو مفہوم مخالف ہے وہ منطوق کے معارض نہیں ہوتا۔

اس توجیہ کا قرینہ یہ ہے کہ اگر مولانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہدایت نہ مانتے تو عام خلق من اللہ (اللہ کا خالق ہونا) نہ مانتے کیوں کہ ہدایت کی تعریف میں لفظ ”خلق“ ہے۔ جب خلق ہدایت کو نہیں مانیں گے تو عام خلق کو بھی نہیں ماننا چاہیے (لیکن امکانی طور پر کیوں کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی ضروری نہیں لیکن ممکن ضرور ہے) (واللہ اعلم)۔

تسبیہ : مذکورہ بالا تو جیہات کے روشنی میں ہر ذی فہم یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ تب تو مولانا کو یہ علوم نہ صرف مستحضر ہیں بلکہ یہ تو ان کے علمی تفتن اور علمی تنوع کی بھی دلیل ہے کہ وہ عام خطاب میں ایسے علوم اگل رہے ہیں جو درس میں بھی پسینہ کا ذریعہ ہے۔ شاید یہ تاثر غیبی ہے۔ وہ حدیث شریف یاد کیجیے جس میں ہے کہ بندہ جب اپنے علم پر عمل کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نہ سیکھے ہوئے علوم اپنی طرف سے عطا فرماتے ہیں۔ شاید وہی ہو رہا ہے۔

توجیہ نمبر چھ : ہمیں معترضین کی ناسمجھی پر تعجب ہے کیوں کہ جب وہ مولانا محمد سعد صاحب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اسباب کی نفی کرتے ہیں جیسا کہ آگے اس کا مستقل ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا اسباب کی نفی کر کے صرف اللہ سے ہونے کو سمجھاتے ہیں کہ اسباب کو نہ مانو بلکہ یہ مانو کہ اللہ ہی کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی نفی کا اعتراض بھی کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا اللہ سے نہ ہونے کو سمجھاتے ہیں کہ اللہ سے نہ ہونے کو مانو یہ تضاد ہے۔ پس قول ساقط الاعتبار ہے۔ اس لیے یا تو اسباب کی نفی کا یا ہدایت کی نفی کا کوئی ایک اعتراض واپس لیجیے۔ اس تضاد کی ایک مثال سمجھیے۔ کفار مکہ کا خیال تھا بشر، نبی نہیں ہو سکتا (اگر غیر بشر نبی ہوتا تو ہم مان لیتے) اور بریلوی حضرات کا خیال ہے کہ نبی، بشر نہیں ہو سکتا۔ کس قدر دونوں نظریوں پر تعجب ہے!!! لیکن یہ تضاد و خصوص کی جانب سے ہونے کی وجہ سے ممنوع نہیں، جب

تدبیر یہی بتاتے ہیں کہ لوگ اپنے دلوں میں خدا کا یقین مضبوطی سے پیدا کر لیں، اور اپنی زندگی ٹھیک کر لیں ان کی صحیح توجہ کے باوجود وہ اس لیے خاطر خواہ کامیاب نہیں کہ تبدیلیہ یقین کی کوئی مستقل جدوجہد بیانات کے بعد عملاً اختیار نہیں کی جاتی، لیکن دعوت و تبلیغ نے یہی طریقہ اپنا کر لوگوں سے عملی جدوجہد کروائی، ان کی جان و مال کی اور ان کے اوقات کی تشکیل کی جس کے نتیجہ میں اس نے اپنا وطر و مقصود حاصل کیا اور لوگ ایسے مضبوط یقین پر قائم ہوئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مٹے نشانات قدم کو زندہ کیا اور صحابہؓ کی طرح تسخیر عالم سے سرفراز ہوئے۔

اب کچھ لوگ حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اسباب کی نفی کا اعتراض کر کے پھر امت کو اسباب کی غلامی میں دینا چاہتے ہیں، حیرت ہے لوگوں کی سمجھ پر! ایسی بھی کوئی نادانی ہوتی ہے یا پھر کسی کے خلاف ان کے دلوں میں آگ بھڑکتی ہے۔ خدا نہ خواستہ معترض کے منشا کے مطابق اگر امت کے ایمان و یقین بے اثر و کمزور ہو جائیں پھر دین ہی کیا رہے پھر تو معترض ہلاک و برباد ہو جائے۔ ہمیں جواب دیجیے کیاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حالات میں اسباب اختیار کرنے سے نہیں روکا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمندر میں گھوڑے نہیں ڈالے۔ کیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے زہر نہیں کھایا؟ کیا عقبہ بن نافع رحمہ اللہ تعالیٰ مع اپنے لشکر افریقہ کے جان لیوا جنگل میں داخل نہیں ہوئے؟ کیا قرآن کریم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنگ حنین میں جب ان کی نگاہیں ظاہری سبب لوگوں کی کثرت پر اٹھیں تو یہ کہہ کر ”إِذَا أَحْبَبْتُمْ كُفْرًا كُفْرًا“ اور باغات کی طرف اٹھیں تو ”لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ کہہ کر آگاہ نہیں کیا؟ جواب دیجیے!

اگر عوام ایس باتیں کریں تو دکھ کی بات نہیں لیکن علماء حضرات ایسی بہکی اور بے تکی باتیں کریں یہ انہیں زیب نہیں دیتا، کہاں گئے علوم، علماء ہو کر شعور و تہذیب کھو بیٹھنے کا اور عام

طوفان میں بہہ جانے کا کیا مطلب!! عالم کو چاہیے کہ جب زبان استعمال کرے تو علمی زبان استعمال کرے۔ مذکورہ باتیں ذہن نشین رکھ کر توجیہ سمجھیے امت کو اسباب کی غلامی سے نکالنے کے لیے ایسی شدت و تغلیظ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کلام موافق حالات اور یہ اسلوب مخاطبین کی رعایت کے مطابق ہے، یہ باتیں ہمیں قرآن و حدیث ہی نے تو سکھائی ہیں، اسلوب اگر اتنا سخت - بظاہر اسباب کے نفی کا - نہ ہوگا تو مردہ ذہنیت میں کبھی جان نہیں پڑے گی۔ یہ فی الحقیقت اسباب کی نفی نہیں ہے۔ مردہ ذہنیت میں جان ڈالنے کے لیے تغلیظ ہے۔

توجیہ نمبر تین : آپ یہ نہ کہیں کہ آپ اعتراض کو صحیح طور پر سمجھیں ہی نہیں، کیوں کہ مولانا محمد سعد صاحب خود اعمال کو اسباب تصور کرنے کو کہتے ہیں یہ ہے اصل اعتراض! تو پھر یاد رکھیے قرآن و حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے اور نظیر ہے۔ قرآن حکیم نے مثلاً، رزق کی تنگی، بیماری اور دیگر ہر قسم کی تکلیف سے نجات کے لیے تقویٰ کی راہ بتائی ہے۔ ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا“۔ نیز نماز کو روزی کا، زکات کی ادائیگی کو مال میں اضافہ کا اور حج کو غنی کا ذریعہ بتایا ہے۔ بلاشبہ شریعت میں اسباب اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے لیکن ان کے یقینوں سے بچانے کی تعلیم اس سے زیادہ قدم قدم پر دی ہے اسے بھی ملحوظ رکھیے۔ لوگوں کو چاہے کہ قرآن و حدیث کی اسباب اختیار کرنے کی تعلیم کو اس کے اعتدالی جہت و پہلو پر منطبق کریں، اس کی اسباب کی غلامی پر محمول نہ کریں، اس قدر اسباب اختیار کرنے کو اسلام کی تعلیم نہ سمجھیں کہ آدمی ان کے اختیار میں ان کا غلام بن جائے اور ان کے یقین کا بھی شکار ہو جائے۔ جس سے شرک کی بو آوے

جدید تعبیر اعتراض کی چیز نہیں :

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا کہنا ہے کہ اسباب دنیویہ پر غیبی کوئی وعدہ نہیں، وعدے اعمال پر ہیں۔ لہذا اسباب پر اعتماد کے بجائے اعمال پر اعتماد کر کے اعمال کی فکر رکھو۔ یہ

اتنی درست بات ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ قرآن وحدیث کے موافق ہے، اس کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا، ہاں یہ ایک ایسی جدید بات، جدید تعبیر ہے کہ آج تک ایسا کسی نے نہیں کہا! تو کیا آج تک کسی کا نہ کہنا اعتراض کی دلیل ہے؟ پھر تو آپ اپنی اس اکلوتی سنہری سوچ کو بازار لیجائیے اور اس کی بڑی قیمت حاصل کیجیے۔ ایک درست بات کو جدید تعبیر میں اس مقصد کے پیش نظر پیش کرنا تاکہ لوگ اپنی پرانی روایت وعادات کو چھوڑ کر حقیقت کو حاصل کریں یہ تو لائق تعریف عمل ہے نہ کہ قابل جرح و تنقید۔

ہم اس کی ایک نظیر پیش کرتے ہیں۔ عامۃً تمام مشائخ تصوف اعمال ومعروفات پر زور دیتے ہیں، لیکن حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیے وہ فرماتے ہیں ”میرے نزدیک ایک منکر ایک گناہ کو چھوڑنا ہزار معروفات پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے۔ اب یہ بات کسی نے نہیں کہی اس لیے اس کو غلط کہیں گے یا اس کی حقیقت پر نظر کر کے اس کو ان کی بصیرت کی دلیل سمجھیں گے۔ یاد رکھیے، بات کا جدید اسلوب، جدید تعبیر واقع فی النفس کا ایک مؤثر طریقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ”اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ عَبْدَ النَّاسِ“ لہذا جدید تعبیر اختیار کرنا بوجہ مؤثر طریقہ یہ ان کے بلند رتبہ ہونے کی دلیل ہے نہ کہ قابل اعتراض چیز۔

مذکورہ اعمال پر وعدوں کی بات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی لکھی ہے۔ حضرت نے تصوف کی طویل حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے جس میں ”خوف ورجا“ کا ذکر ہے۔۔۔۔۔ جب اس کی جبلت پر یقین کا غلبہ ہوا اور اس نے ہر جہت سے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تو لازمی طور پر ”رجا اور خوف“ تما متر اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم اور اس کے وعدوں سے متعلق ہو گیا اور اب اس کا اعتماد اسباب کے پیدا کرنے والے سے متعلق ہو گیا نہ کہ اسباب سے۔۔۔۔۔“ (ازالۃ الخفاء، مترجم ج ۴ ص ۳)۔ حضرت نے بھی فرمادیا کہ یقین کا تعلق وعدوں سے ہو گیا اور اس کا اعتماد اللہ سے وابستہ ہو گیا نہ کہ اسباب سے، اور یہ تو بہت بڑا درجہ ہے تصوف

میں۔ اب اس پر بھی اعتراض کریں گے؟۔ بلکہ حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”اسباب کے بغیر بھی مسببات وجود پذیر ہو سکتے ہیں، کیوں کہ اسباب صرف اسباب ہیں، خدا نہیں ہیں۔ مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱۵۲)۔

(۵) اعتراض، اجرت علی التعلیم، اجرت علی الزنا کے مثل ہے: توجیہات سے پہلے چند چیزیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اسلام کا مزاج اشاعت علم کا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو اس قدر تعلیم میسر ہو جس طرح انہیں ان کی دنیوی ضرورتیں کھانا پینا اور لباس اور سواری وغیرہ۔ اس لیے اب اسے کسی بندھن میں بند کرنا اس نظریہ کے خلاف ہوگا۔

(۲) مذکورہ نظریہ کی وجہ سے اسلام کا یہ بھی متفقہ نظریہ اور فیصلہ ہے کہ اسلام کی تعلیم بلا اجرت ”مفت“ ہے۔ چنانچہ قرون ماضیہ کو چھوڑیے دور حاضر کے علماء عرب نے بھی یہ بات لکھی ہے اور ہم نے اپنی کتاب ”اولاد کی تربیت“ میں اس سے اقتباسات لیے ہیں کیوں کہ قرآن کا نعرہ ہے ”وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ“۔

(۳) اجرت علی التعلیم ایک تعلیمی اہمیت کے پیش نظر بعد میں ”وقت کے معاوضہ“ کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے، جب لوگوں کا رجحان دین و ایمان اور اس کی تعلیم کی طرف کم ہو گیا۔

(۴) بعض مسائل کو سمجھنے میں عرف کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ ہمارے جمہوری ملک میں تعلیم کا نظام مسلمانوں کی رقومات پر برقرار ہے۔ جس کی وجہ سے علماء اور عوام کے ذہن میں تعلیم کا ایک ایسا نقش بیٹھا ہوا ہے کہ تعلیم تو اجرت ہی کے راستے حاصل ہو سکتی ہے یعنی تعلیم پر تنخواہ کا لینا اور دینا نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ ضروری بھی، کیوں کہ تعلیمی ادارے چلانے والے خود علماء حضرات ہیں، تنخواہ لینا اور دینا انہی کے ذریعہ ہوتا ہے تو تعلیم بلا اجرت کا تصور ایک گناہ کے مرادف ہو گیا ہے۔

توجیہ : مذکورہ امور کی روشنی میں سمجھیے کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تعلیم پر حاصل کی جانے والی اجرت کو اجرت علی الزنا سے تشبیہ دے کر تعلیم کی اصلیت اور اس کی وہ حقیقت سمجھانا چاہتے ہیں جس کی تعلیم خود مقتضی ہے۔ جن کا اشارہ ہم نے کیا، خصوصاً دور نبوی ﷺ اور دور صحابہ رضی اللہ عنہم اور دور تابعین اور تبع تابعین۔ رحمہم اللہ تعالیٰ کی طرف لیجانا چاہتے ہیں جس میں تعلیم کا یہ طریقہ نہیں تھا جو آج ہے کیوں کہ دور نبوی اور اس کے بعد بھی مکمل تین صدی تک تعلیم کا اصل ٹھکانہ مسجد تھی۔ ہم نے ماقبل میں لکھا ہے کہ موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء بقول علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ چوتھی صدی سے ہوئی۔ سب سے پہلے اہل نیشاپور نے ”مدرسہ بہقیہ“ کی بنیاد ڈالی اس کے باوجود لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، کیوں کہ عام رواج دور نبوی سے علم کو مسجد سے لینے کا تھا۔ نیز مسجد سے ہر کوئی علم حاصل کر سکتا تھا اور مدرسہ سے لینے میں یہ بات نہیں تھی۔ اور ایسا کیوں نہ کرتے جب پوری دنیا میں تبلیغ بلا اجرت ہو رہی ہے تو تعلیم کے بلا اجرت ہونے میں کیا دقت ہے !!

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی بات قابل اعتراض اس وقت ہوتی جب وہ فقہی مسئلہ کی رو سے ناجائز اور حرام فرماتے، لیکن یہاں توفیقہ کا تصور بھی نہیں، یہاں تو تعلیم کی اصلیت و حقیقت کو آشکارہ کرنا مقصود ہے، کیوں کہ تعلیم کے علی الاجرت جائز ہونے کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ لوگ تعلیم کی اصل حقیقت سے بالکل نااہل رہیں۔ نیز اعتراض سے تو یہ شبہ لگتا ہے کہ اجرت واجب و ضروری ہے جو خلاف شرع ہے۔ بلکہ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں تو یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ حضرت مولانا نے اس بارے میں زیادہ شدت سے بھی کام نہیں لیا۔ اگر شدت بھی اختیار کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔

کیوں کہ اب تو علمی انحطاط اس قدر ہے کہ۔۔۔ خود بعض علماء حضرات کو بھی نفس تعلیم کا مسئلہ معلوم نہ ہوگا وہ تو اصلاً ہی اجرت کو جائز و لازم سمجھتے ہوں گے، اگر یہی بات ہے تو

مسئلہ سنگین ہو جائے، کیوں کہ ناجائز کو جائز پھر جائز کو واجب اعتقاد کرنا ہوا، العیاذ باللہ۔ پھر تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حکم ہو۔ چنانچہ ”إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ“ حدیث شریف کے تحت لکھا ہے کہ ”هَذَا إِشْعَارٌ بِأَنَّ طَالِبَ الدُّنْيَا لَيْسَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْوَرَثَةِ“ اور امام غزالی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو دنیا کے فانی اور عقبی کے باقی سمجھنے کو نہ صرف اقل علم کہا ہے بلکہ ”أَقْلُ الْإِيمَانِ“ بھی کہا ہے ”قَالَ الْغَزَالِيُّ: أَقْلُ الْعُلَمَاءِ بَلْ أَقْلُ الْإِيمَانِ أَنْ يَعْرِفَ الدُّنْيَا فَرَانِيَةً وَأَنَّ الْعَقْبَىٰ بَاقِيَةٌ“ (مرقات ۱/۲۸۱)۔!! لہذا اب حضرت مولانا کے قول کا مطلب ہوا ”اُكْتِسَابُ الْأَجْرَةِ بِالتَّعْلِيمِ بِنَاءً عَلَى الْأَصْلِ كَأَخْذِ الْأَجْرَةِ عَلَى الزَّكَاةِ“۔ یعنی یہ تشبیہ زمانہ خیر القرون کے لحاظ سے ہے۔ مولانا کے قول سے فائدہ یہ ہوگا کہ تعلیم کا اصلی علم لوگوں کو ہوگا اور اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی اتباع کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

سوال : بات تو ٹھیک ہے لیکن حضرت مولانا نے جو تشبیہ دی ہے وہ فنیج ہے جو مناسب نہیں۔
جواب : جب وقت کا تقاضہ فنیج چیز کے ساتھ تشبیہ کا ہو اس وقت غیر فنیج چیز سے مقصود و مراد حاصل نہیں ہو سکتی لہذا یہ تشبیہ بر محل ہے اور مطابق اصول ہے۔ اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول مذکور میں یہ جملہ کہ ”زنا کا لوگ، تعلیم قرآن پر اجرت لینے والوں سے جنت میں پہلے جائیں گے“۔ یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے جو حیاۃ الصحابہ میں موجود ہیں ”يَا أَهْلَ الْعِلْمِ وَالْقُرْآنِ لَا تَأْخُذُوا بِاللُّعْلَمِ وَالْقُرْآنِ ثُمَّ نَأْتِ بِكُمُ الزَّكَاةَ إِلَى الْجَنَّةِ“ (حیاۃ الصحابہ ۳/۳۳۳)۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس جگہ تعلیم کی بحث کے تحت تعلیم و تبلیغ کا فرق بھی واضح ہو جائے۔

تعلیم و تبلیغ میں فرق :

سطور بالا میں توجیہ کے ضمن میں تعلیم کی اہمیت بھی آگئی، اب ہم یہاں تعلیم و تبلیغ میں کیا فرق ہے وہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں، کیوں کہ بہت سے علماء حضرات سے بھی کبھی کبھی سننے کا اتفاق

ہو جاتا ہے کہ علماء حضرات بھی مدرسہ میں بذریعہ تعلیم، تبلیغ بھی انجام دے رہے ہیں، یہ جملہ کتنا درست ہے وہ آپ ذیل میں پیش کردہ فرق سے سمجھ لیں۔

(۱) حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ”بے طلبوں کو دین دینا تبلیغ ہے اور طالبین کو دینا تعلیم ہے۔“

(۲) دونوں کا مادہ علی حدہ علی حدہ ہے۔ ایک کا ہے ”علم“ دوسرے کا ہے ”بلغ“، یعنی دونوں میں لغوی اتحاد بھی نہیں ہے کیوں کہ دونوں کے مفہوم میں ترادف نہیں جیسے قعد اور جلس میں ہے جس کو اتحاد عرفی کہتے ہیں۔

(۳) دونوں بحسب المصدق بھی ایک نہیں ہیں۔ جیسے اسلام اور ایمان بحسب المصدق ایک ہیں۔ کیوں کہ اتحاد بحسب المصدق کے لیے ”عدم مغایرت“ ضروری ہے جو ثابت نہیں پھر کیسے مساوی؟ ہاں اگر اصطلاحاً دونوں میں عدم مغایرت ثابت ہو جائے تو تساوی کی نسبت بن جائے گی۔

(۴) قرآن وحدیث میں دونوں کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ”يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ۔۔“ ”بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً“ اور تعلیم کے لیے ہے ”۔۔۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۵) عملاً دیکھا جائے تو آں حضرت ﷺ سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ”تبلیغ“، نقل و حرکت میں اور ”تعلیم“ مسجد نبوی میں اور صفہ پر بیٹھ کر ثابت ہے۔ یعنی واقع اور خارج کے لحاظ سے بھی اتحاد نہیں۔

(۶) تبلیغ بلا معاوضہ رائج ہے اور تعلیم میں مشاہرہ رائج ہے۔

(۷) تبلیغ سے ہر کوئی مستفید ہو رہا ہے، مدارس کی تعلیم سے ہر شخص مستفید نہیں ہو رہا ہے۔ اب بتائیے کہ مدارس میں تعلیم دینا تبلیغ بھی ہے! ہاں تبلیغ میں تعلیم کا انضمام ہو جاتا ہے۔ المختصر۔

(۶) اعتراض، معجزہ کا سبب دعوت ہے یعنی معجزہ دعوت کے ساتھ خاص ہے، نبی کے ساتھ نہیں۔

توجیہ: نہ صرف حضور ﷺ میں۔ بلکہ ہر شخص میں۔ دو دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت محمد بن عبد اللہ ہاشمی کی۔ دوسری ”محمد رسول اللہ“ کی۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ ”معجزہ“ کا تعلق محمد بن عبد اللہ کی جہت سے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی جہت سے ہے۔

تو حضرت مولانا محمد سعد صاحب یہی تو کہہ رہے ہیں کہ معجزہ ”محمد رسول اللہ“ کی جہت کے ساتھ خاص ہے، اگر یہ نہ مانیں تو اسلوب کلام بتاتا ہے کہ پھر معجزہ کا تعلق ”محمد بن عبد اللہ“ کی جہت کے ساتھ خاص ہے جو قطعاً غلط ہے۔ اب چاہے نبی کی نبوت اور اس کی رسالت اس کی ذات پر منتہی ہوگئی جس کی وجہ سے انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن ”کار نبوت“، یعنی ”دعوت و تعلیم وغیرہ“ اب بھی باقی ہیں تو معجزہ کا تعلق ”دعوت سے“ بتلانا کیسے غلط ہوا۔ یہی بات تو صحیح ہے!

اسی وجہ سے تولى کی کرامت پر ”معجزہ“ کا اطلاق باس معنی ہوا ہے کہ وہ اپنے نبی کی نبوت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ ولی میں بھی دو جہتیں ہیں۔ ایک اس کی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے ”خارق عادت امر“ میں کرامت کی جہت اور دوسری اس کے نبی کی طرف نظر کرتے ہوئے ”وہی کرامت“ میں معجزہ کی جہت۔ کیوں کہ لکھا ہے کہ اگر یہ ولی ”نعوذ باللہ“ اگر اس ”کرامت“ میں اپنی نسبت نبی کی طرف نہ کرے بایں معنی کہ اس نبی کے امتی ہونے کو تسلیم نہ کرے بلکہ مستقل بالذات ہونے کا مدعی ہو تو نہ وہ ولی ہوگا۔ بلکہ وہ کافر ہوگا۔ نہ ”خارق عادت“ کرامت۔ یعنی ولی کی کرامت میں بھی معجزہ کی جہت غالب ہے خلاصہ یہ کہ خارق عادت امر جو بھی ہو ”معجزہ یا کرامت“ وہ معجزہ ہے چاہے براہ راست نبی سے صادر ہو تب بھی اور اس کے کسی امتی سے صادر ہو تب بھی البتہ فرق یہ ہے کہ ایک اصلاً معجزہ ہے دوسرا تبعاً ہے۔ یہی بات شرح عقائد میں ہے، عبارت پر غور کیجیے۔

”وَيَكُونُ ذَلِكَ أَى ظُهُورُ خَوَارِقِ الْعَادَاتِ مِنَ الْوَلِيِّ ” مُعْجَزَةٌ .
لِلرَّسُولِ الَّذِي ظَهَرَتْ لَهُ هَذِهِ الْكَرَامَةُ لِوَاحِدٍ مِنْ أُمَمِهِ لِأَنَّهُ يَظْهَرُ بِهَا أَى بِتِلْكَ
الْكَرَامَةِ أَنَّهُ وَلِيٌّ... حَتَّى لَوْ ادَّعَى هَذَا الْوَلِيُّ الْاِسْتِقْلَالَ بِنَفْسِهِ وَعَدِمَ الْمَتَابِعَةَ
لَمْ يَكُنْ وَلِيًّا وَلَمْ يَظْهَرْ ذَلِكَ عَلَى يَدِهِ . وَالْحَاصِلُ أَنَّ الْأَمَرَ الْخَارِقَ لِلْعَادَةِ فَهُوَ
بِالنِّسْبَةِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ مُعْجَزَةٌ سِوَاءِ ظَهَرَ مِنْ قَبْلِهِ أَوْ مِنْ قِبَلِ أَحَادِ أُمَمِهِ
وَبِالنِّسْبَةِ إِلَى الْوَلِيِّ كَرَامَةٌ لِحُلُولِهِ عَنْ دَعْوَى نُبُوَّةٍ -- “ (شرح عقائد ۱۰۷)

اور یہی بات ” شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی - رحمہ اللہ تعالیٰ - نے بھی ” میزان
العقائد “ میں لکھی ہے جو شرح عقائد کے اخیر میں ملحق ہے۔ ” ثُمَّ الْخَارِقُ قَدْ يَظْهَرُ عَلَى يَدِ
وَلِيٍّ وَهِيَ مُعْجَزَةٌ لِلنَّبِيِّ - ﷺ (شرح عقائد ۱۳۲)

ہم اس کی نظیر بھی پیش کر دیتے ہیں۔ علم قراءت میں ایک ہے قرأت۔ اور دوسری
ہے روایت۔ سات قراء ہیں اور ان کے دو دوشاگرد ہیں یعنی چودہ۔ ہم لوگ شاگردوں کے
واسطوں سے قراء تک اور ان کی قراءت تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان شاگردوں سے مروی
طریق پر پڑھیں گے جیسے ” امام حفص رحمہ اللہ تعالیٰ “ تو اس میں بھی دو جہتیں ہیں، جو بھی شاگرد
سے مروی روایت پڑھیں گے اس میں اگر پیش نظر راوی ہے تو اس مروی کو ” روایت “ کہیں گے
اور اگر اسی مروی میں نظر راوی کے بہ جائے ” قاری “ ” استاذ “ پر ہے تو ” قراءت “ بن جاتی ہے۔ یہ
دونوں ایک ہی ہیں صرف نظر کے فرق سے روایت اور قراءت کا فرق ہو جاتا ہے۔ بس اس طرح
ولی کی کرامت میں بھی اگر نظر نبی کی طرف ہو تو وہ ” معجزہ “ ہے اور اگر نظر ولی کی طرف ہو تو وہ
کرامت ہے۔ معلوم ہوا معجزہ نبی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس نبی کے کام کو جو بھی انجام
دے اس کے ہاتھ پر بھی معجزہ (کرامت) ظاہر ہوتا ہے جس کام کو کائنات کہتے ہیں چاہے پھر
دعوت ہو کہ تعلیم دین۔ تو بات بالکل درست ہے کہ معجزہ نبوت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

(۷) اعتراض، خروج فی سبیل اللہ فرائض شرعیہ پر مقدم ہے:

توجیہ نمبر ایک: اس جملہ سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا ہے یہ از قسم مبالغہ
ہے اور مبالغہ درست و جائز ہے۔ اس سے مقصود شریعت و دین سے مزاحمت نہیں۔
توجیہ نمبر دو: یہ نہ فی الواقع عقیدہ و مسئلہ کی خبر ہے۔ نہ خلاف شرع انشاء عقیدہ یعنی نہ اس بات
کی خبر دینا ہے کہ شریعت میں ایسا عقیدہ یا مسئلہ ہے اور نہ اپنی جانب سے کوئی نیا عقیدہ بنا کر
لوگوں کو اس پر بلانا ہے، بلکہ فی الحال، واقع حال کی خبر دینا ہے یعنی دعوت و تبلیغ کی جدوجہد سے
جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہ بتانا ہے کہ لوگ فرائض اسلام سے انتہائی دور ہیں لیکن جب وہ دعوت
و تبلیغ سے جڑ جاتے ہیں تو اب دو چار نہیں سینکڑوں فرائض پر کھڑے ہوتے ہیں لاکھوں لوگ اس کی
مثال ہیں، تو مطلب اس وقت لوگوں میں پہلے دعوت آتی ہے پھر فرائض زندہ ہوتے ہیں اس کی خبر
دینا ہے تو خروج، فرائض شرعیہ پر مقدم ہوا۔ ” لَا تَقُومُوا لِلرِّجَالِ بِالْفَرَائِضِ حَتَّى يَخْرُجُوا فِي
سَبِيلِ اللَّهِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ” (البقرة ۲۱۷) ” اب بتائیے کیا غلط ہے!!

توجیہ نمبر تین: اگر اس قول کو کوئی تاویل کا جامہ نہ پہنایا جائے اور اسے حقیقت پر ہی رہنے دیا
جائے تب بھی کوئی اعتراض نہیں اس کی پوری گنجائش ہے، بایں معنی کہ یہ ابتداء اسلام کے حال کی
ترجمانی ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ” حضرت عائشہ رضی اللہ
عنہا فرماتی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے احکامات نازل فرمانا چاہا تو پہلے مفصل سورتیں نازل فرمائیں
جن میں جنت و جہنم کا ذکر ہے تاکہ صحابہ کرام کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پیدا
ہو جائے۔۔۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حکم نازل کر دیا جاتا کہ تم شراب نہ پیو تو لوگ کہہ دیتے ہم کبھی
بھی شراب چھوڑنے والے نہیں، اسی طرح زنا کا حال۔۔۔ خلاصہ یہ کہ پہلے صحابہ کا ایمان بنایا گیا
اور انہیں مختلف آزمائش میں ڈالا گیا پھر احکامات عطا کیے گئے تاکہ احکامات چھوڑنے کا مسئلہ ہی
پیش نہ آوے (بخاری شریف ۷۲/۷۳)۔ تو دیکھیے اس حدیث میں فرائض کا مؤخر ہونا اور اسلام و

ایمان کے بنانے اور انہیں راہ خدا میں خروج کرانے کا مقدم ہونا معلوم ہوا۔ اور یہی بات مرقات میں بھی ہے۔ ”إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ“ حدیث شریف کے تحت لکھا ہے ”وَلَمْ يُكَلَّفُوا أَوَّلًا إِلَّا بِالتَّوْحِيدِ ثُمَّ بَعْدَ مُدَّةٍ فَرَضَ عَلَيْهِمْ مِنَ الصَّلَاةِ ثُمَّ فَرَضَ عَلَيْهِمْ رَمَضَانُ ثُمَّ تَتَابَعَتْ الْفَرَائِضُ“ (مرقات ۳۹/۲)۔ بالکل بات واضح ہوگئی!

(۸) اعتراض، قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے:

توجیہ نمبر ایک : حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول میں شرعی فقہی واجب مراد نہیں ہے کہ اعتراض کیا جاسکے، ماقبل کے مباحث پر نظر ڈالیے اس کی کئی مثالیں ہم نے لکھی ہیں، یہ بہ طور تحریر ہے، ”لغوی اور عرفی واجب“ مراد ہے۔

توجیہ نمبر دو : دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں صرف نہ ناظرہ پڑھنے کا معمول تھا نہ حفظاً بلکہ فہم و تدبر اور تقاضہ آیت پر عمل کرنے کے ساتھ تھا اور چوں کہ اس کام کا منہج سیرت صحابہ پر قائم ہے تو اس منہج پر اٹھانے کے لیے ”ایک جدید تعبیر“ میں واجب کہا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا وہ یہ ”فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا“ (الاقان ۱۷۶/۲)۔ اور موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سورہ بقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال گزارے اور مسند احمد میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ ال عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ (الاقان ۱۷۶/۲۔ نوع ۷۷)۔

یہ تھا صحابہ کا حال، کیا امت کو اس پر لانا کوئی گناہ ہے؟ آپ کہیں گے اس پر لانا تو کوئی گناہ نہیں ہے لیکن شرعاً واجب کہنا گناہ ہے!! تو ہم کہیں گے جب ہم نے پہلے ہی کہہ دیا کہ یہ شرعی و اصطلاحی واجب نہیں بلکہ عرفی ہے، تاکیداً ہے، تحریراً ہے، ایک جدید تعبیر ہے، تو پھر اعتراض کیسے؟ اور اس کے بغیر آپ کر سکتے ہیں تو کر کے بتائیے!! پھر امت کو رسمیت و بے

روح و بے جان چھوڑنا اچھا ہے کہ اس طرح کے ہاتھ پیر مارنا اچھا ہے! ذرا سمجھ سے کام لیجیے خواہ مخواہ کوئی کام کر رہا ہے اس میں رکاوٹ نہ ڈالیے! رہا یہ سوال کہ مولانا نے ترک فہم پر نفع کی نفی کی ہے کہ ایسی تلاوت کا کوئی نفع نہیں بلکہ گناہ کا باعث قرار دیا ہے تو یہ کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سمجھ کر پڑھنے پر جو نفع و اجر حاصل ہوتے ہیں اس کی نفی ہے۔ مطلق تلاوت سے حاصل نفع و اجر کی نفی نہیں ہے کہ نفس تلاوت کا بھی اجر نہ ہو۔ ”تَنْفَعُ التَّلَاوَةُ بِالْفَهْمِ صَاحِبَهَا أَكْثَرُ مِنْ مَحْضِ التَّلَاوَةِ فَلَا تَنْفَعُهُ ذَلِكَ مَحْضُ التَّلَاوَةِ“۔ اور گناہ کے اطلاق کی تاویل وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں تھی یعنی ”بزعم الدعوت“ کہ اصحاب دعوت کے یہاں سمجھ کر نہ پڑھنے پر گناہ ہے یعنی عرفی گناہ۔

(۹) اعتراض، فرشتوں کا اور نگ آباد (مہاراشٹر) کے اجتماع میں نزول:

توجیہ نمبر ایک : دراصل یہ کیا جملہ ہے؟ ہم نے تو نہیں سنا، سننے سے پوری طرح بات سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تاویلات پیش کر دیتے ہیں۔ کام کے عجیب و غریب تاثرات کے پیش نظر ناممکن تو کیا مستبعد بھی نہیں۔ حیاۃ الصحابہ میں ہزاروں واقعات لکھے ہیں اور آج کے دور میں ملکوتی مخلوق نہ سہی زمینی بہت ساری مخلوقات کے محیر العقول واقعات اہل تبلیغ کے ساتھ پیش آئے ہیں لہذا یہ مستبعد بھی نہیں۔ بلکہ ملکوتی مخلوق کے ماننے پر بھی محمول کر سکتے ہیں کیوں کہ جب ہم اس سے پہلے کرامت معنوی مان چکے ہیں تو کرامت حسی جو کم رتبہ ہے کیوں نہیں مان سکتے!

توجیہ نمبر دو : مولانا کے اس جملے میں ۳ احتمالات ہیں (۱) بلا دیکھے جھوٹ کہہ رہے ہیں (۲) دیکھ کر سچ کہہ رہے ہیں (۳) دیکھ کر یا بن دیکھے سچ اور جھوٹ سے قطع نظر پختہ یقین کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔ پہلے کے دو احتمال کو چھوڑ دیجیے تیسرے احتمال کو لیتے ہیں۔ پھر اس قول کی گنجائش اور اس کی صحت میں کوئی تردد نہیں کیوں کہ جب اس درجہ کسی کا یقین ہو کہ وہ گویا عین یقین سے دیکھ رہا ہے تو یہ رویت ہی کے درجہ میں ہے۔ امام رازیؒ نے آخرت کی جنت نعیم اور دنیا کی جنت

معرفت میں جنت معرفت پر خیر کا اطلاق کیا ہے۔ ”إِنَّ جَنَّةَ الْمَعْرِفَةِ خَيْرٌ مِنْ جَنَّةِ النَّعِيمِ“ (تفسیر کبیر ۱/۱۷۷)۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دو اہم نکاتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ ہماری کتاب (نَجِّی النَّفْسَ فِي صَلَاحِ الْاِمَامَةِ ۸۵/۳) میں ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ آخرت میں جنتی کو جو لطف جنت میں آئے گا اس سے زیادہ دنیا میں عارف کو معرفت والی جنت میں آتا ہے۔ جس کی وجہ یہی پختہ یقین ہے۔ لہذا عین یقین سے دیکھ کر فرمایا ہے لہذا نہ ناممکن ہے نہ جھوٹ ہے بلکہ ایسا سچ ہے جس پر کوئی تعجب بھی نہیں۔ اسی یقین کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے ”لَوْ خُيِّرْتُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالْمَسْجِدِ لَخْتَرْتُ الْمَسْجِدَ“ (مرقات ۲/۲۱۳)۔

توجیہ نمبر تین : یہ توجیہ نمبر دو کی طرح ہی ہے انداز بدلا ہوا ہے۔ مشاہدہ دو طرح کا ہے۔ ایک حسی دوسرا معنوی۔ یہاں مشاہدہ معنوی سے خبر دی جا رہی ہے کہ فرشتے نازل ہوئے، لہذا یہ برحق ہے بلکہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے بلند درجہ ہونے کی دلیل ہے۔ ہم اس کی نظیر حدیث شریف سے پیش کرتے ہیں اجابت اذان کی شہادت سے۔ اجابت اذان میں جب کوئی شخص شہادت دیتا ہے جو ”اشھدان لا اله الا الله“ میں ہے تو حدیث شریف میں ہے ”دخل الجنة“ بصیغہ ماضی ہے۔ آپ اسے وعدہ خداوندی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن وعدہ کے بہ جائے اسے خبر مانیں جس کا فریضہ صیغہ ماضی ہے تو نہ صرف اس کا احتمال ہے بلکہ یہی احتمال قوی ہے جس کا مطلب وہ اس جنت میں داخل ہو بھی گیا۔ یہی باتیں شرح نے لکھی ہیں۔ (دیکھیے مشکوٰۃ پر حاشیہ از مرقات ۲/۱۶۲)۔ اب بتائیے کہ دنیا میں رہ کر جنت میں داخل ہونا زیادہ مشکل ہے کہ فرشتوں کا اترنا زیادہ مشکل ہے؟ یہاں علماء نے لکھا ہے کہ خدا کا اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے جو شہادت دی وہ عظیم مشاہدہ سے دی ہے ”مشاہدہ معنوی“ صرف زبان سے رٹ کر یا کمزور یقین سے نہیں دی ہے معلوم ہوا ”معنوی مشاہدہ“ ایسی چیز ہے کہ اس پر خدا کے خصوصی

انعام ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا یہ جملہ ”مشاہدہ معنوی“ پر محمول ہے ”فلا کذب ولا استحال فتدبر“۔ آسان طریقے سے سمجھیے جب تبلیغی حضرات مجلس منعقد کرتے ہیں تو بیان کے شروع میں کہتے ہیں کہ فرشتوں نے ہماری مجلس کو گھیر رکھا ہے جس طرح یہاں فرشتوں کا نزول قابل تعجب نہیں تو پھر وہاں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

(۱۰) اعتراض، جو مجھے امیر نہ مانے وہ جہنم میں جاوے:

توجیہ نمبر ایک : جب امارت کا نچ ہی درست ہے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا امیر ہونا بھی ایک یقین کے درجہ میں ہے تو پھر یہ جملہ بھی خفیف ہے۔ کیوں کہ امیر کی مخالفت کرنے والے کو تو قتل کرنے کا حکم ہے۔

توجیہ نمبر دو : یہ جملہ مخصوص شخص کو اس مخصوص حال میں کہا ہے جب مولانا کو بہت تنگ کیا گیا، جسے معترض نے عموم کے اسلوب میں پیش کیا ہے جو نقل کے لحاظ سے خیانت ہے۔ آدمی طیش میں آکر بسا اوقات زبان سے ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس کی حقیقت مراد نہیں ہوتی سوائے طلاق نکاح اور رجعت۔

توجیہ نمبر تین : امر کئی معافی کے لیے مستعمل ہے۔ آپ اس کو ”إِحْمَلُوا مَا شِئْتُمْ“ کی طرح تہدید، کُلُّوا وَاشْرَبُوا کی طرح اباحت اور فَأَتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ کی طرح تعجیز کسی بھی معنی پر محمول کر لیں۔

توجیہ نمبر چار : ہم اس جملہ کو حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے واقع میں حقیقت پسند اور حامل دین حقیقی پر ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں یعنی ان میں تکلف و تورع اور تصوف نہیں ہے ورنہ آدمی علورتبہ کے لحاظ میں ظاہر میں سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن اندرونی طور پر حسد، جذبہ انتقام وغیرہ مفساد میں مبتلا ہوتا ہے لیکن علورتبہ کے خلاف بات ظاہر کر دی اور باطن کو صاف رکھا۔ جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک موقع پر مشرک کے لیے گالی دینا۔ اور بھی کئی توجیہات ہیں ہم نے اختصاراً اکتفاء کیا ہے۔

(۱۱) اعتراض بغیر حضور قلب کے ذکر الہی کرنے والا خطا کار گنہگار ہے۔

توجیہ نمبر ایک : یہ بات غلط نہیں ہے۔ ماقبل میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات نماز کے بارے میں گزر چکے ہیں، اور نماز کو قرآن حکیم نے ذکر فرمایا ہے ”اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي“ شاید حضرت مولانا محمد سعد صاحب کی مراد ذکر سے نماز ہو تو پھر گنہگار ہونا ظاہر ہے۔ یوں بھی دیکھیے کہ آدمی گناہوں کی وجہ سے خدا سے دور ہوتا ہے (صغریٰ)۔ بعض احادیث میں بعض نمازیوں کی نماز کو خدا سے دوری کا سبب بتایا ہے (کبریٰ) نتیجہ بغیر حضور قلب کے نماز و ذکر گناہ ہیں یا کہیہ گناہ کا سبب ہیں۔

یاد رکھیے شریعت نے احکامات کو ان کی ظاہری شکلوں کے ساتھ باطنی مخصوص مقاصد کے تحت عائد کیے ہیں، جب وہ مقاصد ہی حاصل نہ ہوں تو صرف یہ نہیں کے مقاصد سے محرومی ہوتی ہے، یہ بھی تو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ مقاصد کو فراموش کرنے کی کوتاہی کی ہے، بس اس کوتاہی کو گناہ اور خطا تصور کیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ حکم کی ظاہری شکل باقی ہو۔ پھر ان باطنی مقاصد کو بعض دفع اتنی اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ عبادت کی ظاہری شکل پلٹ جاتی ہے یعنی اچھی کو بری اور بری کو اچھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ ”لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَائُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ“ کے تحت لکھا ہے کہ ”عبادت کی خاص صورتیں اصل مقصود نہیں بل کہ دل کا اخلاص و اطاعت مقصود ہے۔ قربانی میں بھی اور دوسری تمام عبادات میں بھی۔“

تفصیل حوالہ سے دیکھ لیں۔ (معارف القرآن ۲۶/۲۷)۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے قول کو اسی نظریہ سے دیکھیں تو بالکل درست نظر آئے گا۔ جس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت کے اس جملے کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ عبادت کی خاص صورتیں مقصود نہیں حالانکہ وہ مقصود ہیں ورنہ نگین حکم ہے دیکھیے (رحمۃ اللہ الواسعہ ۳۲۲/۱)۔ قندبر۔

”مُعَصِيَةٌ أَوْ رَثْتُ ذُلًّا وَاسْتَحَقَّارًا خَيْرٌ مِنْ طَاعَةٍ أَوْ رَثْتُ عَجَبًا وَاسْتَكْبَارًا“۔

(مرقات ۱۳۸/۱) کہ ایسا گناہ جو آدمی میں ندامت پیدا کرے اور اس کی نظر میں اس کی اپنی ذات کو ذلیل و حقیر دکھائے وہ اس عبادت و نیکی کے کام سے بہتر ہے جو اس میں عجب و تکبر پیدا کر دے۔ توجیہ نمبر دو : یہ جملہ ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ بلند مرتبہ لوگوں کے حق میں ہے، تاکہ بلند مرتبہ کے بعد بھی وہ غفلت نہ کر جائیں کیوں کہ بلند مرتبہ کی وجہ سے ادنیٰ غفلت تو دور کی بات نیکی کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی اس اصول پر ”مُبَاهَاةُ الْعَوَالِمِ سَيِّئَاتُ الْأَكْبَارِ وَحَسَنَاتُ الْأَكْبَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ“۔

(۱۲) اعتراض، حیاۃ الصحابہ کے علاوہ کتابوں کو پڑھنے سے روکنا:

توجیہ : حیاۃ الصحابہؓ کے مطالعہ کا پابند بنانے میں نہ تو دوسری کتب اسلامیہ کی تنقیص مقصود ہے نہ کلیۃ ممانعت۔ یہ ممانعت کسی حاذق طبیب کی کسی پرہیز کی چیز سے ممانعت کی طرح ہے جو ایک معقول چیز ہے۔ حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فضائل ذکر یا قرآن میں لکھا ہے کہ ایک شیخ نے اپنے مرید کو ذکر کی تلقین کی لیکن خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو مراقبہ و محاسبہ کی تلقین کی اور ذکر سے ممانعت کی پھر کچھ وقت کے بعد قرآن شریف کی تلاوت سے بھی ممانعت کر دی جس پر لوگوں کو اعتراض بھی ہوا کہ شیخ نے تو قرآن پڑھنے سے بھی روک دیا لیکن جب دل کی کیفیت حاصل ہوئی اور ذکر و تلاوت کی اجازت دی تو اب حال بدل گیا (فضائل اعمال) تو قرآن سے ممانعت کی طرح ہے۔ لہذا حضرت مولانا کا مقصود بھی یہی ہے۔ اسے آسان مثال میں مدارس کے نظام سے سمجھا جاسکتا ہے ہمیں بتائیے کہ کوئی طالب علم یا استاذ تعلیمی اوقات میں مقررہ کتاب کو چھوڑ کر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہے تو کیا یہ درست ہے؟ یہاں قرآن کی تلاوت سے ممانعت کا جو مقصد ہے وہی وہاں بھی ہے۔

تجب ہے لوگوں کی سمجھ پر کہ اگر اپنے شعبے کی کتاب پڑھئے تو کہیں تو اعتراض کہ دوسری کیوں نہیں؟ اور دوسری کتاب ”منتخب احادیث“ لاتے ہیں تو بھی اعتراض کہ دوسری کیوں لائے؟ اور اپنی سوچ پر ناز بھی کرتے ہیں اور دوسرے کی سوچ پر اعتراض بھی کرتے ہیں!!

(۱۳) اعتراض تکمیل توبہ کے لیے اللہ کے راستہ میں نکلنا شرط ہے

توجیہ نمبر ایک: توبہ کے لیے یہ بات تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی شرط ہے گناہ کو چھوڑنا۔ لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح گناہ کو چھوڑنا ضروری ہے اس طرح دواعی گناہ بھی چھوڑنا ضروری ہے، کیوں کہ دواعی اگر خیر کے ہیں تو انہیں خیر کا اگر شر کے ہیں تو انہیں شر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دواعی زنا پر زنا کا اطلاق ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آدمی اپنے مقام پر رہ کر جان و مال کو غلط استعمال کے راستے سے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ بھی کسی درجہ میں دواعی گناہ ہوئے تو راہ خدا میں نکلنے سے ان کو چھوڑنا حاصل ہوگا یہ تو نفس تین شرطوں ہی کی بات ہے۔ نفس تین شرطوں پر زائد کا سوال ہی نہیں اٹھتا کیوں کہ دواعی کا حکم تو اصل کے ساتھ ملحق ہے پھر پوری امت یا جمہور کے اتفاق کے خلاف کہاں ہے؟ اس لیے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا یہ کہنا کہ توبہ کی تکمیل کے لیے نقل و حرکت شرط ہے کوئی غلط نہیں۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی شرح مسلم میں انہی دواعی ذنوب کے چھوڑنے کو درست قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تائب کا ان جگہوں کو چھوڑنا جہاں ذنوب لاحق ہوئے ہیں علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس پر معاون بننے والے دوستوں کو چھوڑنا بھی۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ اہل خیر، علماء حضرات، عبادت گزار متقی اور ان لوگوں کی صحبت اختیار کرنا جن کی لوگ اقتداء کرتے ہیں اور جن کی صحبت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، ان سب کے ذریعہ توبہ میں تقویت و پختگی پیدا ہوتی ہے۔ (۳۵۹/۲)۔ اور راہ خدا میں یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

توجیہ نمبر دو: الفاظ پر غور کریں تو کوئی خاص اعتراض کی چیز نہیں پائیں گے اس لیے کہ تکمیل توبہ

کے لیے ہی تو کہا جا رہا ہے نفس توبہ کے لیے تو نہیں کہا جا رہا ہے، نفس توبہ کے لیے جو تین شرائط ہیں وہ اپنی جگہ ہیں اس سے تو کچھ بھی تعرض نہیں۔ نیز تکمیل ایمان کے لیے کچھ چیزیں نفس ایمان کے علاوہ بتائی گئی ہیں، تکمیل جماعت کے لیے بھی کچھ علی حدہ چیزیں بتائی گئی ہیں بس اس طرح یہاں تکمیل کے لیے خروج کو مانیں تو پھر کیا اعتراض ہے؟

(۱۴) اعتراض تنہائی میں گناہ کرنا بے حیائی ہے اور علانیہ گناہ کرنا کوئی بے حیائی نہیں ہے۔
توجیہ نمبر ایک: تنہائی میں مخلوقاتی کوئی مانع نہیں، ہاں اگر وہاں کوئی مانع ہے تو صرف خدا یعنی خالق۔ اور خالق کے سامنے گناہ کرنا ہی بڑی اور اصلی بے حیائی ہے، برخلاف ظاہر کے وہاں مخلوقاتی مانع موجود ہے وہاں اتنی بے حیائی نہیں جتنی تنہائی میں۔

سوال: ظاہر میں بھی خدا ہے جیسے تنہائی میں ہے، پھر آپ کی یہ بات کیسے درست ہے؟
جواب: تنہائی میں صرف خالق ہے جہاں ترجیح کا کوئی سوال نہیں اور ظاہر میں خالق و مخلوق دونوں ہیں لیکن قابل ترجیح مخلوق ہے نہ کہ خالق، کیوں کہ احکام دنیویہ میں ظاہر کا لحاظ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کے لحاظ سے لباس کا پہننا اور نہ پہننا دونوں برابر ہوتا کیوں کہ اس کے سامنے ستر کا حال لباس میں ایسا ہی ہے جیسا بلا لباس پھر کیوں لباس کا اہتمام کرتے حالاں کہ تنہائی میں بھی لباس صرف اس کے ادب کے لحاظ سے پہنا جاتا ہے اور اسی ادب کی رعایت میں نماز میں ستر پوشی فرض قرار دی گئی ہے ورنہ لباس کا اس کے سامنے کوئی کام نہیں کیوں کہ وہ لباس میں اسی طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح بلا لباس میں۔ (مرقات)

توجیہ نمبر دو: تنہائی کی اہمیت کے خاطر علانیہ کی نفی کی گئی تاکہ اس کی بے حیائی زیادہ ظاہر ہو۔ یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ علانیہ میں بالکل بے حیائی نہیں جیسے ”لا افضل من السکوت شیئ“

(۱۵) اعتراض تمام مسائل کو مرکز لے کر آیا کرو:

توجیہ: مسائل سے اگر فقہی مسائل ہوں تو مدارس کے علماء ومفتیان حضرات سے بچا کر مرکز نظام الدین کے علماء ومفتیان کے پاس بلانے کا مقصد یہ ہے کہ ان مسائل کو صرف فقہی رو سے ہی نہیں بلکہ فقہی اور دعوتی دونوں کی روشنی میں حل کیے جائیں تاکہ گنجائش کی حد تک جاسکیں کیوں کہ تبلیغی کام اس طرح حکمت سے کیا جاتا ہے کہ جس سے ناقص الایمان لوگ کامل الایمان بنیں جس کے لیے بعض دفع ظاہری شریعت بھی چھوڑنی پڑتی ہے، حقیقی اور پوری شریعت زندہ کرنے کے لیے جسکی دسیوں مثالیں ہمارے تجربہ میں ہیں بلکہ تبلیغی تمام علماء ومفتیان کے علم میں بھی ہوتی ہیں، لیکن یہ دوسرے کے ایمان کے خاطر برداشت کر لیا جاتا ہے۔ سمجھیے حضرت موسیٰ وحضر علیہما السلام کی طرح۔ وہاں دونوں کا مشرب علی حدہ علی حدہ تھا، وہ امت محمدیہ کے تفوق کی وجہ سے ایک ہی شخص میں مجتمع ہے۔ ماشاء اللہ۔ اور کیوں نہ ہو سکتا جب کہ شریعت کا اصول صرف ادب کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر دونوں کا خالق ہے، لیکن شر کی نسبت بہ جائے خدا کے ادباً شیطان کی طرف کردی جاتی ہے۔ (علم عقائد) تو پھر ایک نامسلمان کو مسلمان بنانے کے لیے وقتی طور پر شریعت کو اس لیے نظر انداز کیا جائے کہ خود شریعت زندہ ہو کون سی قباحت کی چیز ہے۔ جیسا کہ ہم نے علوم ظاہرہ وعلوم باطنہ میں تفصیل کی ہے۔ اور اگر مسائل سے ”امور و حالات“ مراد ہوں جو خروج کے لیے مانع ہوں تو پھر کوئی اعتراض ہی نہیں۔

(۱۶) دعوت و تبلیغ کی چھ صفات مکمل دین ہیں:

توجیہ نمبر ایک: ہم تو یہ سمجھتے ہیں چھ بھی زیادہ ہیں اگر یہ کہا جائے کہ صرف دو صفات ”کلمہ و نماز“ پورہ دین ہے تب بھی غلط نہیں۔ کیوں کہ کلمہ میں عقائد اور نماز میں تمام احکام آسکتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض احادیث میں پیٹ اور رشم گاہ کے گناہ سے بچنے کو یا بعض قرآن کی سورتوں مثلاً سورہ العصر کو مکمل دین کہا کیوں کہ وہ امہات دین پر مشتمل ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ”امہات دین“ پر مکمل دین کا اطلاق کیا ہے۔

توجیہ نمبر دو: بعض اہم امور کو لے کر بقیہ سے نظر انداز کرنے کی یہ تعبیر ہے۔ جیسے ہم نے دین و شریعت کے مختصر خاکہ میں قرآن وحدیث کے ذکر نہ ہونے پر کہا تھا۔ صفحہ ۳۱ پر۔

(۱۷) **اعترض مسلمان کو چاہیے** کہ مشورہ میں حاضر ہونے کا اہتمام نماز سے بھی زیادہ کریں۔

توجیہ نمبر ایک: ہمارے دین اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ لوگوں کو دین کی طرف حکمت سے بلایا جائے ”أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ۔۔“ حضرت مولانا کے یہ الفاظ کس قدر حکمت بھرے ہیں! تب ہی تو تبلیغ نے دنیا کو فتح کیا ہے اور لوگوں کو اعتراض ہے؟ صرف ظاہری الفاظ کو دیکھتے ہیں اندر کی بھری ہوئی بندوق کی گولی کی طرح اس کی طاقت نہیں دیکھتے۔ جب آدمی مشورہ میں آئے گا تو یقیناً نماز پر آئے گا جو عماد الدین ہے اور جب عماد الدین پر آئے گا تو پھر پورے دین پر آئے گا (سبب بول کر مسبب مراد لیا ہے) اب کیا اعتراض؟

توجیہ نمبر دو: نیز نماز پر صراحتاً بلانا اور نماز پر کنایہ بلانا دونوں میں وزن کنایہ کا زیادہ پڑتا ہے ”الْكِنَايَةُ أَبْلَغُ مِنَ الصَّرِيحِ فِي التَّأْيِيدِ“ یہاں نماز پر بطریق مشورہ ”کنایہ“ بلایا ہے۔

توجیہ نمبر تین: یہ بھی ہماری شریعت کی تعلیم ہے کہ لوگوں کو دین و ایمان پر اس طرح کھڑا کیا جائے کہ کھڑا کرنے کے طریقے سے مخاطب، دین کا انکار نہ کر بیٹھے، لہذا حضرت مولانا محمد سعد صاحب نماز کی طرف مشورے کے طریق سے بلاتے ہیں تاکہ خدا نہ خواستہ کوئی انکار کرے تو نماز کا انکار لازم نہ آئے۔ جیسا کہ علماء اسلام نے وضو کے بارے میں فرمایا ہے کہ وضو میں فرض پر کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کی دوستوں کو مقدم رکھا ہے تاکہ کسی وجہ سے اگر باطل ہو تو سنت ہو فرض باطل نہ ہو۔ دیکھیے کس قدر شریعت کے احکام کی پیروی ہے پھر بھی اعتراض ہے!! یہ ہم نے چند اہم اعتراضات کی توجیہات پیش کی ہیں بقیہ غیر اہم کی توجیہات کو بڑے علماء حضرات پر اعتماد کرتے ہوئے چھوڑ دیا ہے وہ ہمارے مباحث سے از خود سمجھ سکتے ہیں۔

آخر میں سب سے اہم بات

اب ہم چلتے چلتے ایک اہم بات لکھ دیتے ہیں امید ہے کہ بہت نافع ہو۔ ہم ”حق“ اور ”دین“ اس کو نہیں سمجھتے جسے عامۃً لوگ سمجھتے ہیں! ہمارے نزدیک ”حق اور دین“ یہ ہے کہ جس کی طلب میں فی الحقیقت ذرہ بھر نہ مال کی طلب ہو نہ عزت و مرتبہ کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرماویں ہم ظاہر میں جتنے طالب دین نظر آتے ہیں، اتنے طالب دین نہیں، بلکہ طالب عزت اور طالب مرتبہ ہیں!

ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی طلب عزت میں دین کو بھی نہ چاہیں۔ مثلاً کسی دوسرے شخص (عالم یا غیر عالم) سے واقع میں دین کا فائدہ ہمارے بنسبت زیادہ ہوتا ہو تو اب ہم یہ چاہیں کہ لوگ اسے چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں نہ دین کی پرواہ ہے نہ دین کی طلب ہمیں تو اپنی عزت کی پرواہ ہے کہ لوگ ہم سے دین لیں اس سے نہ لیں تو پھر ہم کیسے اور کتنے بڑے دیندار ہوئے ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ اس مختصر بات کی تفصیل چند صفحات پر آ سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کے دینی طرز عمل کی حقیقت اور اس کی توثیقی نظیریں

بذریعہ سابقہ مضامین ان اعتراضات و احکامات سے ”حضرت مولانا محمد سعد صاحب“ کے مبرہ ثابت ہونے کے بعد جوان پر ہوئے تھے، اب مناسب ہے کہ حضرت کے دینی و دعوتی طرز عمل کی کچھ ایسی حقیقت پیش کی جائے جس سے لوگ انہیں بہ آسانی سمجھ سکیں۔ چنانچہ سابقہ مضامین میں جو مذکور ہیں وہ تو اس حقیقت پر دال ہے ہی مثلاً:

(۱) ان کا ”مشروب بالدعوت ہونا“۔ (فطری اصول)۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا کبھی چھوٹوں سے وہ کام لینا جو بڑوں سے نہ لیا ہو۔ (ملا علی قاری)۔ مزید دیکھیے صفحہ ۱۶۳ پر غلط فہمی کا ازالہ۔

(۳) ایمانیات و تصدیقات میں موثر کلام (بمنزلہ کرامت معنوی)۔

(۴) مولانا میں علمی تقنن و معرفتی تنوع۔

ان سابقہ حقائق کے بعد اب ذیل کے مضامین بھی ملحوظ رکھیے۔ تو ان شاء اللہ ایسی حقیقت واضح ہوگی کہ ان سے جو ایک قسم کی بدظنی قائم ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے۔ ہم ذرا یہ سوچیں کہ ایک طرف حضرت مولانا اتنے بڑے مرتبے پر اتنا بڑا کام کر رہے ہیں!! پھر وہ دین و شریعت کو کیوں چھوڑیں گے وہ اس میں مداخلت کیسے کریں گے! جو ایک نمازی بھی گناہ سمجھتا ہے پھر مولانا کیسے کریں گے؟ اگر اس پر غور کریں گے تو تھوڑا کچھ تو حل نظر آئے گا۔ اس حل کا ایک طریقہ یہ سمجھیے کہ ویسے تو ہر بڑا عالم، دین و مذہب کا شیدائی ہوتا ہے لیکن حضرت مولانا ”دین و امت، شریعت و سنت اور احیاء قرآن و حدیث کے انتہائی حریص و شیدائی ہیں۔ اور فرق مراتب تو ایک مسلم اصول ہے۔ جس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو اپنے خاندان سے ملی وراثت اور دوسری ملی فطرت۔ جس کے نتیجہ میں اب ان کا طرز عمل کچھ جدا گانہ مثلاً یہ ہوگا کہ ہر عام و خاص شخص یہ کہے گا کہ ماں باپ کی نافرمانی جائز نہیں ان کی فرامبرداری ضروری ہے۔ یہ بالکل شریعت کے موافق ہے۔ لیکن حضرت مولانا فرمائیں گے کہ ”ماں باپ کی فرامبرداری کو چھوڑو پہلے راہ خدا میں نکلو“ تو ”بظاہر“ یہ جملہ شریعت کے خلاف ہے لیکن اس جملہ کی گہرائی اور اس کی عاقبت پر غور کریں کہ مولانا ایسا کیوں فرماتے ہیں تو معلوم ہو جائے گا مولانا کا منشادین کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کے برعکس شریعت کو پورے طور پر زندہ کرنا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ راہ خدا میں نکلنے سے مانع بنیں تو ان کی

فرما برداری چھوڑ داور پہلے راہ خدا میں جاؤ تا کہ خدا کے ہزاروں احکام میں فرما برداری حاصل ہو۔ اور اگر ایک فرما برداری میں رہو گے تو ہزاروں احکام میں فرما برداری سے محروم رہو گے۔ تو دیکھیے کس قدر ان کا طرز عمل درست ہے!! بلکہ راہ خدا میں جانے کے بعد ماں باپ کی فرما برداری بھی حقیقی معنی میں آئے گی رسمی طور پر نہیں۔ اس طرح غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عام علماء حضرات کی بات اور حضرت مولانا کی بات میں کوئی ٹکراؤ نہیں دونوں صحیح ہیں۔ بس طرز جداگانہ ہے۔

عام غلط فہمی کا ازالہ

عامۃً یہ بھی ہم سے سمجھ کی خطا ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ ہم بڑے کی بات کو بڑی سمجھیں اور چھوٹے کی بات کو ہمیشہ چھوٹی بلکہ غلط سمجھیں۔ یاد رکھیے ہم بڑے علماء حضرات کی قدر و منزلت پر کوئی حملہ نہیں کر رہے، اگر ہماری بات کا یہ مطلب آپ نکالیں گے تو خدا کے دربار میں آپ جواب دہ ہوں گے، ہم بھی یہ بات دین کی موافقت میں کہہ رہے ہیں کیوں کہ بعض دفع چھوٹوں کو نہ سمجھنے سے بھی دین چھوٹنے کی صورت بن جاتی ہے اور ہم اس کے ”مقرر“ ہیں اور اقرار کرنے والے کا قول معتبر ہوتا ہے اس کو آپ تسلیم نہیں کرتے تو آپ پر جواب دہی لازم ہوگی۔ لہذا بعض دفع چھوٹوں کی باتوں پر بھی دھیان دینا ضروری ہوتا ہے۔ ہم اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان دو مثالوں سے سمجھیے کہ ان میں چھوٹوں سے وہ کام ہوا جو بڑوں سے نہیں ہوا۔

پہلی مثال : علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ان کا مقام علماء حضرات جانتے ہیں تفصیل یہ ہے کہ دو متضاد قول میں جمع و تطبیق نہ صرف ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کی ضرورت قدم قدم پر پیش آتی ہے۔ انہی میں سے ایک وہ جگہ بھی ہے جہاں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسا وہ بڑا عالم۔ جو پتھر کو سونا ثابت کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں تطبیق مشکل ہے۔ حالاں کہ ان کی پوری کتاب تطبیق سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع بھی کوئی تطبیق کی صورت نہ ہو اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ کسی دوسرے عالم کے پاس بھی تطبیق کی صورت نہ ہو۔

وہ مقام یہ ہے کہ ایک طرف علماء اسلام فرماتے ہیں ”اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی“ دوسری طرف علماء اسلام یہ بھی فرماتے ہیں کہ ”جو شخص بھی خلق قرآن کا قائل ہو یا جنت میں رویت باری کو ممتنع سمجھتا ہو یا شیخین کو سب و شتم کرتا ہو وہ کافر ہے۔ (شرع عقائد ۱۲۲)۔ دیکھیے دونوں قول میں تضاد ہے، جس کی تطبیق ضروری ہے، چنانچہ شرح نے اس کی تین تطبیقات پیش کی ہیں، باوجودیکہ علامہ کو کوئی تطبیق سمجھ نہیں آئی۔ (نہر اس ۳۴۲)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کبھی کبھی بڑے کو جو بات سمجھ نہیں آتی وہ چھوٹے کو سمجھ آ جاتی ہے۔ لہذا اثبات ہوا کہ کبھی چھوٹے کی بات میں بھی حق و صداقت ہوتی ہے۔

دوسری مثال : محدثین رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے بڑے عالم نے سند عالی سند سافل کے تحت لکھی ہے۔ حضرات علماء کرام خصوصاً محدثین جانتے ہیں کہ سند عالی کی طلب محدث کی غایات میں سے ایک ہے۔ یحییٰ بن معین۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ سے وقت مرض میں پوچھا گیا کہ کوئی چاہت تو فرمایا ”خالی بیت عالی سند“ احمد بن اسلم۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے فرمایا قرب اسناد قرب الی اللہ ہے۔ وغیرہ اسی وجہ سے تمام محدثین: متقدمین و متاخرین نے علو اسناد میں بڑی دلچسپی لی، حتیٰ کہ متاخرین محدثین نے اس کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ بقول علامہ ابن حجر دین کے اہم امور کو بھی فراموش کر دیا ”وَقَدْ عَظُمَتْ رَغْبَةُ الْمُتَأَخِّرِينَ فِيهِ حَتَّى غَلَبَ ذَلِكَ عَلَى كَثِيرٍ مِنْهُمْ بِحَيْثُ أَهْمَلُوا الْإِسْتِعَالَ بِمَا هُوَ لَهُمْ مِنْهُ“ (زہدہ النظر ۹۵)۔ شرح نے اہم کام کی نشاندہی یہ کی ہے مثلاً حفظ و اتقان اور عفت و احسان اور اسناد صحیح اور احوال روادۃ کی تحقیق وغیرہ کہ یہ اہم تھے لیکن انہیں فراموش کر دیا۔ (شرح قاری زہدہ النظر ۱۹۴، ۱۹۵)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض دفع بڑے حضرات سے بھی اہم امور عدم توجہ کے شکار ہو جاتے ہیں اور چھوٹوں کی توجہ اس طرف ہو جاتی ہے۔

مذکورہ دو مثالوں کو ہمارے دعویٰ کی دلیلیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر انکار ہے تو بیچے اب دو دلیلیں دیدیتے ہیں اسے قبول فرمائیے۔ ایک ابن حجر اور دوسری شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔ دونوں کا ڈھنگ بھی الگ الگ ہے۔ ایک میں چھوٹے بڑے کا اور دوسرے میں اگلے پچھلے کا ذکر ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ اگلوں نے جو کچھ قرآن وحدیث سے مستنبط کیا ہے وہ صحیح یا راجح ہو، بعد کے علماء کے استنباط بھی صحیح یا راجح ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح لکھا ہے کہ بعض علماء اسلام نے آیات واحادیث کی جو تفصیل وتفسیر کی ہے، ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی تفصیل وتفسیر سے زیادہ قابل قبول ہو، علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور فوق کل علم علیم ایک مسلم حقیقت ہے۔ ترجمانی حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ الواسعہ ۱۵۴۱)۔

ہم نے ماقبل میں جو لکھا ہے ”إِنَّ لِكُلِّ آيَةٍ يَسْتَوُونَ أَلْفَ فَهْمٍ“ اس سے بھی حضرت شاہ صاحب کے قول مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ نیز جب ایک ایک آیت کریمہ کے اتنے سارے مفہام ہو سکتے ہیں، جب کے ہمارے علم میں دو چار مفہام ہوتے ہیں بھر جدید مفہام کا انکار درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے بعض حالات میں شاذ تفسیر کا اور سلف کے خلاف کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ اب دوسری دلیل، حافظ ابن حجر کا قول ملا علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے آپ تفصیل حوالہ سے پڑھ لیں، حدیث شریف ”إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبَعْضِ بُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ“ کے تحت بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مجتہد دلیل کا پابند ہے اور اس کے لیے دلیل کی وجہ سے پوری گنجائش ہے کہ دوسرے کو خطا پر قرار دے بلکہ اس کی خطا پر قسم اٹھانا چاہے تو اٹھا سکتا ہے چاہے ”خطا کار“ رتبہ میں اس سے بڑا ہو اور علم میں بڑھا ہوا ہو۔ صاف صاف بات ہے جسے سمجھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ چنانچہ مرقات کی فہرست میں اس جگہ عنوان یہ

ہے ”الْاِخْتِلَافُ مَعَ الْاَكْبَادِ بِاللَّدِيلِ جَائِزٌ“ (مرقات ۱۰۰/۴)۔

یہ بات دراصل غور وفکر کی ہے لیکن لوگ غور وفکر سے کام نہیں لیتے جس سے جو بات دریافت کرنی چاہیے یعنی پانی چاہیے وہ نہیں پاتے وہ یہ کہ بعض حضرات بڑے ہی حساس ہوتے ہیں اور انتہائی متیقظ ہوتے ہیں جس سے وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اصلاحی ایسی باتیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کا ذکر دیگر بڑے حضرات بھی نہیں کرتے۔ مثلاً حکیم الامت علامہ تھانوی، حضرت قاری صدیق صاحب باندہ اور شاہ ابرار الحق ہردوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ جو حضرات ان ہستیوں کو جانتے ہیں وہ ہماری اس بات سے اتفاق ضرور کریں گے۔ وہ حضرات باریک باریک اصلاحی باتیں کہتے بھی ہیں اور تحریر بھی ایسی ہی لاتے ہیں۔ بس حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا حال بھی ان کی طرح ہے۔ ہم اس کی وضاحت چند نظیروں سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) کوئی عالم دین مثلاً یہ کہے ”بعض معصیتیں ”گناہ“ طاعت ”نیک کام“ سے بہتر ہوتی ہیں۔ یا یہ کہے کہ بعض کو ”بیت اللہ“ یعنی مسجد میں بھی خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور بعض کو ”بیت الخلاء“ میں بھی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ پہلی بات سے بہت سے عوام بلکہ علماء حضرات بھی بھڑک جائیں گے کہ جو چیزیں شریعت میں طاعت ومعصیت ہیں ان میں معصیت، طاعت سے بہتر کیسے ہو سکتی ہے!! اسی طرح دوسری بات میں بھدی تشبیہ سے بھڑک جائیں گے۔ لیکن یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ کیوں کہ جو گناہ آدمی کو شرمندہ بنادے اس نیک عمل سے بہتر ہے جو آدمی میں عجب پیدا کرے۔ (مرقات ۱۳۸/۱)۔

(۲) ہم اپنے تجربہ کی مثال دیتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان میں سرفہرست یہ بات ہے کہ ”کلمہ توحید کی شہادت دے“ یہ عوام و خواص اور مکتب سے لے کر ادارے کے آخری درجہ تک یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ کلمہ کی گواہی دینا۔ لیکن کبھی غور کیا کہ یہ ”گواہی یعنی شہادت“ کیا ہوتی ہے؟

ہم نے جب طالب علمی کے زمانہ میں یہ سنا تو سوچنے لگے کہ یہ گواہی کیسی؟ اس کو نہ کوئی مقرر کہتا ہے، نہ کوئی استاذ بتاتا ہے، نہ کوئی مصنف لکھتا ہے اور نہ کوئی ایسا شخص بتاتا ہے جس سے اس کا سوال کیا جائے۔ جب کہ اس کا ذکر بنیادی ارکان میں کیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنے زمانہ تدریس و تعلیم میں ہزاروں کتابوں کے مطالعہ میں بھی صرف ۴/۲ مصنفین کو پایا ہے جنہوں نے اس کی حقیقت بیان کی ہے۔ چنانچہ اس ضرورت و اہمیت کی بنا پر ہم نے اپنی تالیفات: اولاد کی تربیت میں اسلامی کردار، فن تدریس کے اصول اور نہج الائمہ فی اصلاح الامہ میں اسے بیان کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھے کہ کوئی مقرر، کوئی معلم اور کوئی مصنف اس کو نہ بولتا ہے نہ لکھتا ہے تو ہمیں بھی نہیں لکھنا چاہیے تو تعجب ان کی باتوں پر ہونے کے بجائے لکھنے پر کیا جائے تو درست کیا ہے آپ سمجھ لیجیے!! کیوں کہ جب شریعت نے لفظ ”اشہد“ کا استعمال کیا ہے تو اس کی بھی تو خاص وجہ ہوگی جو ہمیں معلوم ہونی چاہیے۔

(۳) یہ بھی ہمارے ذوق کی مثال ہے۔ آج ۱۴۴۰ھ مدت عمر ۵۵ سال تک دسیوں مرتبہ اختتام بخاری شریف کی مجالس میں شرکت کا موقع میسر آیا۔ چوں کہ مزاج حقیقت دین کا ہے اور طبیعت میں تحقیق کا عنصر غالب ہے تو ہمیشہ یہ طلب رہتی تھی کہ مشہور مقولہ ”أَصَحُّ الْكِتَابِ بَعْدَ كِتَابِ اللَّهِ صَحِيحُ الْبُخَارِيِّ“ کی سند معلوم ہو جائے کہ اس کا قائل کون ہے؟ اب تک نہ مشافہتاً نہ تحریراً جواب مل سکا۔ اور نہ مختلف شارحین بخاری شریف نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ ”تحفہ القاری“ محدث جلیل حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری دامت برکاتہم ”ایضاح البخاری“ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ میں نفس مقولہ تک کا ذکر ”فی علمنا“ موجود نہیں۔ البتہ ”کشف الباری“ شیخ سلیم اللہ خاں صاحب۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ نے مقولہ تو ذکر کیا ہے لیکن قائل کی نشاندہی یہاں بھی نہ وارد (کشف الباری ۱/۱۷۵)۔ جب کہ مسلم شریف کی شان پر مشتمل مقولہ ”

مَا تَحْتَ آدِيمِ السَّمَاءِ أَصَحُّ مِنْ كِتَابِ مُسْلِمٍ“ کی سند تو خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے کہ وہ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے (نزہۃ النظر ۳۰)۔ لیکن کوشش سے یہ ضرور معلوم ہو سکا کہ شاید قائل حضرت امام بخاری کے شاگرد رشید ”فربری“ رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں کیوں کہ امام بخاری سے ان کے بعد کے محدثین تک بخاری شریف کا سماع متصل سے صرف ان سے ثابت ہے۔ اس طرح کا اشارہ ”عقد الدرر“ میں علامہ آلوسی نے فرمایا ہے۔ (عقد الدرر شرح نزہہ)

خلاصہ یہ کہ اس طرح کی باتوں سے بھڑکنا نہیں چاہیے وہ ظاہر میں چاہے اجنبیت وحشت پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن ان سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ وہ اصلاحی گوشوں کی طرف مشیر بھی ہوتی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے ”عَلَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ“۔ اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ”كِرِهْنَاكَ فِي الْإِيتِدَاءِ مُحَمَّدًا عَلَى الْإِيتِهَاءِ“ گزر چکا ہے۔ بس حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کا طرز عمل یہی ہے۔

مسلم دستور اور دعوت و تبلیغ کے دو زمانے

کوئی بھی کام چاہے دینی ہو یا دنیوی، انفرادی ہو یا اجتماعی اس میں مضبوطی لانے اور اس میں ترقی حاصل کرنے کے لیے فطری یہ اصول ہے کہ اس کام کو بالترتیب کیا جائے، بلا تدریج نہ مضبوطی حاصل ہوتی ہے نہ اس میں ترقی اور یہی اصول خدا کا بھی دستور ہے۔ چنانچہ اسی دستور پر کائنات کی تخلیق اور قرآن حکیم کی تنزیل پیش آئی باوجودیکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ ایک بارگی کائنات کو پیدا فرمادیں اور قرآن حکیم کو ایک ساتھ ایک ہی وقت نازل فرمادیں۔ اس تدریج میں سب سے بڑی چیز جو ملحوظ ہے وہ لوگوں کی ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی اور ان کی سہولت۔ اسی علت خفییہ کی وجہ سے بعض احکامات شرعیہ بھی اسی تدریج کے اصول پر فرض ہوئے مثلاً شراب کی حرمت وغیرہ۔ اس کی تائید حسی مثال سے ہوتی ہے۔

حسی مثال بچہ کا لباس ہے کہ جب اس کا قد چھوٹا ہوتا ہے تو اس کا لباس بھی چھوٹا ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کا قد بڑھتا ہے تو نہ صرف اس کا لباس بڑھتا ہے بلکہ قصد ابرہا یا جاتا ہے۔ یہ ہے ترقی، بس اس وضاحتی تفصیل سے دعوت و تبلیغ کے گذشتہ دو زمانوں کو اور ان کی حالتوں کو سمجھنا اور سمجھانا ہماری غایت ہے اور پھر موجودہ زمانہ دعوت کو اور اس کی حالت کو سمجھنا اس سے بھی بڑی غایت ہے۔ جو مذکورہ چیزوں کو نہ سمجھے وہ دعوت و تبلیغ کی حقیقت و حالت کو بھی سمجھ نہیں پائے گا اور جو ان کو سمجھ لے وہ اس کو بھی سمجھ لے گا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ زمانہ تبلیغ کی دو حالتیں اور دو قسمیں ہیں۔

پہلی حالت: حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک کی حالت یہ زمانہ اول ہے۔

دوسری حالت: حضرت مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اس مسند پر آنے تک کی حالت یہ زمانہ ثانی ہے۔

جو شخص بھی تعمق و تيقظ سے پورے زمانہ تبلیغ پر غور کرے گا اور مذکورہ بالا اصول و دستور کو ملحوظ رکھے گا تو یہ سمجھ لے گا کہ زمانہ اول میں ضرورت ”دعوت و تبلیغ“ کی بنیاد ڈالنے کی اس کے تعارف کی اور اس کی اہمیت ظاہر کرنے کی تھی۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے دو شخصیتوں سے وہی کام لیا۔ اس وقت کے ملفوظات ان کے بیانات ان کی فکریں سب ہی اسی سے متعلق تھے۔ یعنی پوری توجہ دعوت پر مرکوز تھی اور ”دین و شریعت“ کے زندہ کرنے پر توجہ ضمنی تھی اور کم تھی، بالفاظ دیگر اول زمانہ میں ”دعوت و تبلیغ“ کی طرف توجہ اصالتاً تھی اور ”دین و شریعت“ کی طرف تبعاً۔

اب چوں کہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد پڑھ چکی تھی اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے تھے

بلکہ اب تو اسے بڑا درجہ بھی دے چکے تھے تو زمانہ ثانی میں ضرورت تھی کہ ”دین و شریعت“ کی طرف توجہ زیادہ ہو اور دعوت و تبلیغ کی طرف کم یعنی ”دین و شریعت“ اصل کے درجے میں ہوں اور تبلیغ تابع کے درجہ میں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسی شخصیتوں کو اٹھایا جو دین و شریعت کو اچھی طرح سمجھا سکیں۔ چنانچہ حضرت مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ تو خاموش مزاج تھے لیکن حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بہ طور خاص یہ کام لیا اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب وغیرہ سے بھی۔

کیوں کہ ضرورت ہی اس کی تھی کیوں کہ پہلے زمانہ کی محنت سے بے دین لوگ اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے ان کی پہلی ضرورت ہی دین تھی نہ کہ تبلیغ۔ چنانچہ یہ کام اپنے تقاضہ کے مطابق ہوا۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب کو اور ان کے بیانات کو جو حضرات جانتے ہیں وہ ہماری بات سے اتفاق کریں گے۔ حضرت ۳۳/۳ گھنٹے بیانوں میں دین و شریعت کو اور اللہ تعالیٰ کے چھوٹے بڑے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اچھی طرح مثالوں سے سمجھاتے جس سے لوگ دین و شریعت لے کر اٹھتے۔ خلاصہ یہ کہ اول زمانہ میں دعوت کی ضرورت تھی تو انہوں نے دعوت کو کھولا اور پوری توجہ دعوت پر صرف کی اور ثانی زمانہ میں احیاء دین و شریعت کی خاص ضرورت تھی اور دعوت کی کم تو انہوں نے احیاء دین اور احیاء سنت پر خاص توجہ صرف کی۔

اب ایک تیسرا دور حضرت مولانا انعام الحسن کے بعد شروع ہونے والا تھا جو اولاً حضرت مولانا زبیر الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے شروع ہوا اب اس دور میں پھر ضرورت پیش آئی دعوت و تبلیغ کی طرف عود کرنے کی کہ اصالتاً توجہ اس کی طرف کی جائے کیوں کہ اب کام پھیل چکا تھا اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد ہر گھر میں مہمان بن چکی تھی۔ لیکن اب اندیشہ تھا کہ جس کام کے ذریعہ دین و سنت میں جان پڑی تھی ”مرور زمانہ“ سے وہ خود بے جان ہو کر رہ جائے تو دوبارہ

”دعوت و تبلیغ کی طرف نہ صرف توجہ کی ضرورت تھی بلکہ اب زمانہ اول سے بھی زیادہ اہمیت کی ضرورت تھی۔ پہلے سے زیادہ کی ضرورت دو وجہ سے تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اگر زمانہ اول کے بقدر ہو تو قوت پیدا نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ تو پہلے سے موجود تھی، دوسرے مرحلے میں قوت پہلے مرحلے کے نسبت زیادہ مطلوب ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ اول زمانہ میں کم افراد کی ضرورت تھی اور اس مرحلے میں ضرورت دنیا کے اکثر مسلمانوں کی تھی۔ مطلب قدیم نچ میں جان ڈالنے کی بھی ضرورت درپیش تھی اور اس میں مزید ترقی کی ضرورت بھی درپیش تھی۔ ان سب وجوہات سے اب اللہ تعالیٰ نے اس طرح تقسیم فرمائی کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب تو مکمل توجہ صرف دعوت و تبلیغ پر فرماویں اور بقیہ اکابرین دعوت دین و شریعت اور احیاء سنت پر توجہ صرف فرماویں تاکہ اب دونوں کام امت میں رائج ہوں اور کسی پر رسمیت طاری نہ ہو۔ اس معقول دستور کے تقاضے سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہی مشیت خداوندی ہے لہذا اب بذریعہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب جو تبلیغ کی اہمیت، اس میں تنقیح و تہذیب اور کچھ تجدید سامنے آرہی ہے وہ اسی دستور کا حصہ ہے۔ اور اسی ترقی کا حصہ ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کا ملفوظ یاد ہوگا کہ مجھ پر اللہ نے جو کام کھولا ہے میں اس کا سوا حصہ سمجھ سکا ہوں۔۔۔ یہ بقیہ حصوں کی تکمیل کا ایک حصہ ہے جس سے بھڑکنا نہیں چاہیے۔ (واللہ اعلم)۔

ما قبل کی ”بالتدرج“ کی بات اور اس کی حسی مثال لباس اور زمانہ تبلیغ کا یہ تیسرا دور اور اس کی تقسیم کے نتیجے میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے حصے میں ”دعوت و تبلیغ“ کی طرف خصوصی توجہ اور اس میں تنقیح و تجدید اور ترقی وغیرہ کا لازمی نتیجہ ”منتخب احادیث“ کا لانا تھا۔۔۔ خود قرآن کا نزول سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ بالتدرج نازل ہوا تو منتخب احادیث کا لانا بھی تدرج کا اور ترقی کا حصہ ہے۔

خاتمۃ الكتاب

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ : قارئین حضرات کے ذہنی تصفیہ کے لیے صراحتاً ہم گزارش کرتے ہیں کہ ازہر الہند دارالعلوم دیوبند، اس کے علماء حضرات۔ دامت برکاتہم۔ اور ان کے فتویٰ کا ذکر جاہ جاموجود ہے، جسے آپ اپنی سمجھ سے ان کی بے ادبی اور توہین نہ سمجھیں، کیوں کہ ہم نے کسی ایک جگہ بھی ”فتویٰ“ کو غلط نہیں کہا، ہاں مسئلہ کی مختلف احتمالاتی صورتوں میں ان کے طرز عمل اور حکمت عملی کے بارے میں کلام کیا ہے، جو کسی طرح ان کی بے ادبی نہیں ہے، بلکہ وہ ”کَلِمَاتُ النَّاسِ عَلَى ” قَدْرٍ ” عَقُولِهِمْ ” مَنَازِلِهِمْ ” کی صورت تھی جس میں ”وَلِلنَّاسِ قِيَمَاتٌ يَعْتَشُقُونَ مَذَاهِبٌ“ کی توسعات مضمر ہیں۔

ہماری بد قسمتی میں کیا شک اگر ہم ”مقدس و متبرک“ ہاتھوں رکھی بنیاد کو اور علمی قلعہ کو منہدم کر دیں! پھر تو نہ ہم محفوظ رہ سکیں نہ ہماری نسلیں۔ ”اللَّهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ ذَلِك“ ہم اس سے قطعاً دل سے خوش نہیں ہیں کہ ہم خود ”اظہار حق و صدق“ کے پردے میں ارادہ بد سے اس پر انگلی اٹھائیں، اور نہ کوئی دیگر، بلکہ ہمارا یقین ہے کہ ”حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم“ بھی اس سے راضی نہ ہوں گے کہ کوئی ان کی جانب داری میں بھی دارالعلوم پر انگلی اٹھائے، بالفرض اگر راضی ہوں تو ہم اس جذبہ کو منکر و مکروہ سمجھیں گے جو بالیقین ان سے متوقع نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان اپنی ماں کے دودھ پینے سے پہلے ہی اپنے دارالعلوم سے ”تحذیک“ حاصل کرتے ہیں!!

حضرت مولانا محمد سعد صاحب: ہم نے حضرت کے بعض اقوال کے بارے میں صاف لکھا ہے کہ یہ ”بین خلاف شرع“ ہے نہ صرف رجوع کرنا چاہیے بلکہ اسے فرض و لازم قرار دیا ہے،

بلکہ اس قول کے ساتھ ادباً۔ العیاذ باللہ۔ بھی لکھا ہے، کیوں کہ حضرت کے اقوال کی صداقت و صحت تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ”غلط“ قول کو بھی ”عقیدت و محبت کا رنگ دے کر صحیح تسلیم کر لیں، غلط کو صحیح بتانا خود غلط ہے!! ذہن نشین رکھیے کہ ”حق و صداقت“ کو چھوڑ کر عقیدت و محبت کی طرف، نسی رشتوں کی طرف، علاقیت کی طرف اور تعلقات روابط کی طرف جھک جانا ”دین“ نہیں، بے دینی اور بد دینی ہے!! ہم نے ۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء کو ”بذریعہ نیٹ“ بیان میں حضرت نے رجوع فرمایا ہے سنا ہے، بلکہ حضرات علماء دیوبند۔ دامت برکاتہم۔ کے تنبیہ پر احسان و تشکر بھی ادا کیا ہے۔ فجزاھم اللہ جمیعاً۔

در اصل عوام کی طرح اکثر علماء حضرات بھی ”علم“ اور ”دین“ کے بارے میں اس قدر حساس نہیں جس قدر ان دونوں کا تقاضہ ہے۔ ہم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ دس سالوں سے حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، ہم چوں کہ ایک بڑے ادارے میں استاذ ہیں اور دعوت سے منسلک بھی ہیں، کتنے ہی لوگوں نے ماضی میں اس کا تذکرہ کیا ہے ہم انہیں جواب میں یہ بھی کہتے تھے کہ حضرت مولانا محمد الیاس اور حضرت مولانا محمد یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ۔ کے پچاسوں ملفوظات ایسے ہیں جن سے ان پر اسی طرح اعتراضات ہو سکتے ہیں جس طرح حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے اقوال پر لیکن آج تک ان کے اقوال پر بڑے بڑے علماء حضرات نے بھی اعتراضات نہیں اٹھائے۔ اب آج جو علماء حضرات بھی حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر اعتراضات اٹھاتے ہیں یا تو وہ حضرت مولانا محمد الیاس و حضرت مولانا محمد یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے ان اقوال کو جانتے ہی نہیں تھے تو یہ ان کے ناقص علم کی دلیل ہے، (لیکن ایسا ممکن ہی نہیں) اور اگر جانتے تھے پھر بھی ان پر اعتراضات نہیں اٹھائے اور مولانا محمد سعد صاحب پر اٹھائے تو یہ ان کے دین کے ناقص ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ یہ ان پر ظلم ہے اور ان سے شاید ”حسد“ ہے۔

اہم بشارت:

دوسری اہم بات یہ کہ ہم نے ابتداءً میں لکھا ہے کہ اس کاوش کے آغاز میں خدا تعالیٰ کی کیا کیا تائیدات حاصل رہیں! اب ہم اختتام پر بھی ایسی ہی اس کی ایک بے پناہ بشارت سنانے بے قرار ہیں! کہ جوں ہی یہ کتاب اپنے تمام مراحل سے گذر کر دلہن کی طرح سمجھنے کے لیے طباعت سے آراستہ ہونے جا رہی تھی تو کریم و رحیم مولیٰ نے چاہا کہ اس کے چہرے پر تبسم و مسکراہٹ بھی ہوتا کہ ”نور علی نور“ کا مصداق ہو۔ رفیق محترم نے ایک پیغام دیا کہ ”نیٹ“ پر ایک کتاب ابھی دست یاب ہے ”حضرت جی مولانا محمد سعد پر ہونے والے اعتراضات کا منصفانہ جائزہ“ از حضرت مولانا مفتی ندیم صاحب مدظلہ پاکستانی جسے جستہ جستہ مقامات سے دیکھا تو دل باغ ہو گیا اور بارگاہ الہی میں سر بہ سجود ہو گیا۔ کہ ہماری فراست غلط نہیں۔ جس میں حضرت مولانا محمد سعد صاحب پر ہوئے اعتراضات و اقوال کی ”توجیہات و تاویلات“ نہیں بلکہ حضرت کے اقوال کے مراجع و مصادر ہی پیش کر دیے۔ ماشاء اللہ۔ جب اقوال کے ماخذ کا عظیم کام انجام پا چکا ہو تو اب تاویلات کے راستے ان اقوال کی صداقت بتانے کی خاص ضرورت نہیں رہتی، لیکن چمن کے ہر پھول کے رنگ و بوجہ جدا ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کو چاہنے والی طبیعتیں جدا جدا ہوتی ہیں تو پھر طباعت سے مزین کیا گیا۔ ”ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ“۔

ہماری درخواست ہے کہ عوام و علماء حضرات ”حق“ بات سمجھنے کے لیے دونوں کتابوں کو بغور پڑھیں۔ اس کتاب میں بہت سارے اقوال میں ”رجوع“ ثابت ہونے کو بھی لکھا گیا ہے اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کا وہ شجرہ نسب بھی مذکور ہے جس میں آپ والا ۳ واسطوں سے سیدنا حضرت ابو بکر صدیق۔ رضی اللہ عنہ۔ تک پہنچتے ہیں۔ نیٹ پر حاصل کرنے کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

اللہ اکبر۔ ابھی تو اوپر کی کتاب کی اطلاع پہنچی ہی تھی اور اسے لکھ ہی رہے تھے کہ عشاء کی نماز کا وقت ہوا تو مسجد میں دو کتابیں رفیق محترم نے ذیل کی تاریخ میں پیش کیں۔

(۱) حضرت مولانا محمد سعد صاحب کے افکار احوال سلف کی روشنی میں۔ از مولانا محمد مطیع الرحمن صاحب حیدر آباد، تلنگانہ۔ نام سے ہی کتاب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ (۲) شوریٰ کی حیثیت آثار و اسلاف کی تحریرات کی روشنی میں۔ از علامہ محمد اسحاق صاحب اُتاوڑی۔ شاگرد حضرت مفتی اعظم۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی۔ شیخ الحدیث جامعہ عربیہ میوات نوح۔ ہریانہ۔ جب دو ماہ پہلے اپنی تالیف کا آغاز کیا تھا تو ایک قسم کی وحشت تھی کیوں کہ اس موضوع پر پہلی کتاب تھی لیکن اب تو تین تین کتابیں سبقت لے گئیں۔ فجز اھم اللہ اجمعین۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۲۲ مارچ ۲۰۱۹ء مطابق ۱۲ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ

تمت بعون اللہ تعالیٰ

قرآن حکیم	امام ابوداؤد	طبقات ابن سعد	محمد بن سعد و اقدی
الاتقان	جلال الدین سیوطی	عقائد نسفیہ	امام نسفی
احکام القرآن	امام قرطبی	عقد الدرر	علامہ آلوسی
ازالہ الخلفاء	شاہ ولی اللہ	فیض ابرار	شیخ ابرار احمد
اصول الافاء	شیخ تقی عثمانی	قصص النبیین	شیخ ابوالحسن ندوی
بخاری شریف	امام بخاری	کنز العمال	شیخ علاؤ الدین ہندی
ترمذی شریف	امام ترمذی	کتاب النقط	علامہ مقریزی
تفسیر کبیر	امام رازی	کرامات امدادیہ	شاہ امداد اللہ
تعلیق الصبح	مولانا محمد ادریس	مسلم شریف	امام مسلم
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	موطا مالک	امام مالک
جامع بیان العلم و فضلہ	ابن عبد البر	مسند احمد	امام احمد
حلیۃ الاولیاء	ابونعیم	مشکوٰۃ المصابیح	خطیب تبریزی
حسامی	فقیہ احیکشی	مرقات شرح مشکوٰۃ	ملا علی قاری
حجۃ اللہ بالغہ	شاہ ولی اللہ	مظاہر حق	علامہ قطب الدین
حیاۃ الصحابہ	مولانا محمد یوسف	میزان العقائد	شاہ عبدالعزیز
دارمی	امام دارمی	مختصر المعانی	علامہ تفتازانی
روح المعانی	علامہ آلوسی	ملفوظات مولانا الیاس	مولانا محمد منظور
سنن کبریٰ	امام بیہقی	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
سیرت خلفاء	مولانا عبدالشکور	مسجد کی آبادی کی	مولانا محمد سعد
شرح مسلم	امام نووی	نزہۃ النظر	حافظ ابن حجر
شرح عقائد	علامہ تفتازانی	نبراس	علامہ محمد عبدالعزیز
شرح نزہۃ النظر	ملا علی قاری	نہج الائمہ	مؤلف کتاب
شرح مآۃ عامل	میر سید شریف	ہماری ملی ذمہ داریاں	سید سلیمان